جلد ٦٩ | مئی ۱۹٦۸ء | عدد ۳

ماھنامہ

ترجمان القرآن

مرتبہ

سید ابوالاعلیٰ مودودی

زر سالانہ : ۸ روپے | فی پرچہ : ۷۵ پیسے

اسلام اور اجتماعیت

از

مولانا صدرالدین اصلاحی

کیا اسلام صرف انفرادی اصلاح چاہتا ہے ؟

کیا باطل قوتوں سے انفرادی طور پر مقابلہ کیا جا سکتا ہے ؟

دین میں اجتماعیت کا کیا مقام ہے ؟

اجتماعیت کے بارے میں کتاب و سنت کی واضح ہدایات

اجتماعیت کی اہمیت اور اس کے زندگی پر اثرات

اسلام کا مقصد و طریق اجتماع

اسلامی اجتماعیت کی ہیئت کاملہ

گوشہ گیری - انفرادیت اور انتشار کے نقصانات

منظم اسلامی زندگی بسر کرنے کے لیے ایک ناگزیر کتاب

عمدہ کتابت و طباعت

خوبصورت جلد

صفحات ۲۰۰

قیمت ۲/۷۵

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ - شاہ عالم مارکٹ لاہور

ترجمان القرآن ، لاہور

فہرست مضامین

جلد ۶۹ | مئی سنہ ۱۹۶۸ء مطابق صفر سنہ ۱۳۸۸ھ | عدد ۳

چندہ سالانہ	ماہنامہ ترجمان القرآن	قیمت فی پرچہ
سات روپے	۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور	۷۵ پیسے

ابوالخیر مودودی پرنٹر پبلشر نے پاکستان پرنٹنگ ورکس میں چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشارات

آج تک دنیا میں جتنی بھی اصلاحی تحریکیں اُبھری ہیں اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسی نہیں جسے خلا میں کام کرنے کا موقع میسر آیا ہو۔ ہر تحریک ایک مخصوص معاشرتی ماحول، ایک خاص سیاسی نظام، ایک خاص نوعیت کے معاشی حالات۔ اور افکار و نظریات اور معتقدات کی ایک خاص فضا میں جنم لیتی ہے۔ اِس بنا پر اُسے ہر مرحلے پر مختلف قسم کے موانع پیش آتے ہیں۔ اُس کی راہ روکنے کے لیے مخالفین مختلف بنیادوں پر محاذ بنایا کرتے اور مختلف نوعیت کے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔

اسی سلسلے میں یہ بات بھی مشاہدے میں آئی ہے کہ دنیا کی جو تحریک جتنی زیادہ جاندار، انقلاب انگیز اور رائج الوقت نظام میں جتنی زیادہ بنیادی تبدیلیاں کرنے کا عزم لے کر اٹھے گی اسی نسبت سے اُس کی مخالفت بھی زیادہ ہوگی اور اُس کے معاندین ایک ایک قدم پر اس کے خلاف پوری قوت سے صف آرا ہو کر اُسے شکست دینے کی کوشش کریں گے۔

یہاں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک کمزور اور نحیف سی تحریک جس کی مخالفت پر پوری قوم اور پورا ملک کمربستہ ہو، اُسے آخر اثر و نفوذ کا راستہ کیونکر مل جاتا ہے۔ اور وہ کس طرح ایک غالب قوت بن کر پورے معاشرے پر چھا جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ کوئی حیات آفریں تحریک خارجی وسائل اور خارجی قوت کے بل بوتے پر کامیاب نہیں ہوتی اور اگر وہ وقتی طور پر کامیاب ہو بھی جائے تو اس کا غلبہ دیر تک قائم نہیں رہ سکتا۔ مستقل اور دیرپا کامیابی کے لیے یہ بات اشد ضروری ہے کہ وہ جس معاشرے میں کام کر رہی ہے اسی معاشرے کے اندر اپنے لیے قوت اور توانائی کا سرچشمہ فراہم کرے۔

اس ضمن میں ہمیں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ کسی تحریک کی مخالفت میں کون کون سے لوگ پیش پیش ہوتے ہیں اور کس قسم کے افراد اُس کے لیے قوت وطاقت فراہم کرتے ہیں۔ گذشتہ چند سالوں میں نفسیات بالخصوص اجتماعی نفسیات اور معاشرت کے ماہرین نے اس سلسلے میں جو تجزیے اور نتائج پیش کیے ہیں وہ بڑے معلومات افزا ہیں۔ مخالفین میں سب سے پہلے وہ گروہ سامنے آتا ہے جو کسی نئی تحریک کی مخالفت مفادات کی بنا پر نہیں بلکہ اصول کی بنیاد پر کرتا ہے۔ یہ گروہ خلوص کے ساتھ مروجہ نظام کو صحیح اور کسی نئے نظام کی دعوت کو غلط سمجھتا ہے اس لیے یہ آخر وقت تک اس کی راہ روکتا ہے۔ لیکن اُس کے اس طرزِ عمل میں کوئی دنیوی مصلحت یا غرض کارفرما نہیں ہوتی بلکہ یہ اُس کے ضمیر کا تقاضا ہوتا ہے۔ یہ گروہ اپنے نظریات میں بڑا مخلص اور اپنے عمل میں بڑا پختہ ہوتا ہے اور اگر یہ نئی تحریک کے دلائل سے مطمئن ہو کر اس میں شامل ہو جائے تو اُس کے لیے بڑی قوت کا باعث بنتا ہے۔ یہ گروہ اگرچہ مخالفت میں بڑی پامردی دکھاتا ہے لیکن کبھی گھٹیا حربے استعمال نہیں کرتا۔ اصول کی جنگ کو شرافت اور خودداری کے ساتھ لڑتا ہے اور فتح و شکست دونوں صورتوں میں اپنے دماغی توازن کو بگڑنے نہیں دیتا۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کے ہر معاشرے میں اس گروہ کی تعداد ہمیشہ بہت کم رہی ہے اور یہ کسی سوسائٹی میں بھی ایک دو فی صد سے زیادہ نہیں بڑھ سکی۔

معاندین کا دوسرا طبقہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے مفادات کسی مروجہ نظام سے وابستہ ہوں اور وہ ان مفادات کی حفاظت کے لیے ہر نئے نظام کی راہ روکتے ہوں۔ اس طبقے کی مخالفت اصول کی بنا پر نہیں ہوتی بلکہ محض اغراض کی خاطر ہوتی ہے۔ یہ طبقہ بڑا مفاد پرست اور سیرت و کردار کے اعتبار سے انتہائی بودا ہوتا ہے اور نئی تحریک کو شکست دینے کے لیے تمام جائز و ناجائز طریقے استعمال کرتا ہے۔ اس طبقے میں بہت سے مختلف گروہ شامل ہوتے ہیں۔

ان میں سب سے پہلا گروہ اُونچے سرکاری عہدیداروں کا ہوتا ہے۔ یہ لوگ اقتدار کے ساتھ وابستگی کی بنا پر کسی معاشرے یا ملک کی اجتماعی قوت کے مالک بن جاتے ہیں اور پھر اپنی اس قوت کو قوم کی فلاح کے لیے نہیں بلکہ اپنے عہدوں کو قائم رکھنے اور اپنے اقتدار سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانے کے لیے مروجہ نظام

کی حمایت میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرا گروہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن کے معاشی مفادات ایک خاص نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کی ساری شاہ خرچیاں اور عیش پرستیاں رائج الوقت نظام کی رہینِ منت ہوتی ہیں اس لیے وہ اس کی بقا کے خواہاں اور آرزو مند رہتے ہیں۔

تیسرے گروہ میں وہ بے فکرے افراد شامل ہوتے ہیں جن کی کسی نظام سے وابستگی کی وجہ بجز اس کے اور کوئی نہیں ہوتی کہ نیا نظام جو اخلاقی پابندیاں عائد کرنے کا دعویٰ لے کر اُٹھتا ہے اور جس ایثار کا اُن سے مطالبہ کرتا ہے وہ اُسے پورا نہیں کر سکتے۔ اور اس کے مقابلے میں مروجہ نظام اُن کی اخلاق سوز حرکات کے لیے انہیں کھلی چھوٹ دے دیتا ہے، بلکہ بعض حالات میں اُن کا پشت پناہ بنتا ہے۔

پھر ایک گروہ ایسے لوگوں پر بھی مشتمل ہوتا ہے جو کسی نظام کو محض اس بنا پر قائم رکھنا چاہتے ہیں کہ اس کے تحت تربیت حاصل کرنے کی وجہ سے اُن کے مزاج کو اس سے گہری مناسبت ہو جاتی ہے۔ اُن کی فکر و نگاہ کے زاویے اس کے عین مطابق اور اُن کے جذبات و احساسات اُس کی فطرت سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے اندر اتنی سکت نہیں پاتے کہ قلب و نگاہ یا مزاج اور سیرت کی کسی تبدیلی کو گوارا کریں۔ اس لیے وہ بہتے ہوئے دھارے کے رُخ پر ہی گامزن رہنا پسند کرتے ہیں۔

جو طبقے کسی نئی اُبھرتی ہوئی تحریکِ اصلاح کے لیے سب سے پہلے قوت و طاقت فراہم کرتے ہیں اُن میں سب سے نمایاں مقام اُن لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اُس تحریک کے نظریات کو دل و جان سے قبول کر کے اس راہ کی مصیبتوں مزاحمتوں اور دشواریوں کو جانتے ہوئے اس کی دعوت پر لبیک کہتے ہیں۔ اس طبقے کو بھی مختلف گروہوں میں منقسم کیا جا سکتا ہے۔

ایک گروہ اُن معدودے چند افراد پر مشتمل ہوتا ہے جنہیں وقت کے غالب نظام میں قوت و طاقت حاصل ہوتی ہے مگر اس کے باوجود وہ نئی تحریک کے اصولوں کے قائل ہونے کی وجہ سے اپنے سارے مفادات کو خود ٹھکرا کر مصائب کی زندگی اختیار کر لیتے ہیں۔ اس گروہ میں بڑی پختہ سیرت و کردار کے لوگ شامل ہوتے ہیں۔ مگر

ان کی تعداد ہر دَور میں بڑی قلیل رہی ہے۔

اس کے بعد اُن لوگوں کی باری آتی ہے جن کے مروجہ نظام سے قطعاً کوئی مفادات وابستہ نہیں ہوتے بلکہ اس نظام کی قہرمانیوں کے وہ ستائے ہوئے ہوتے ہیں اور اس بات کی آرزو کرتے ہیں کہ کسی طرح ان سے انہیں نجات ملے۔ یہ افراد بڑے اخلاص اور سچے جذبے کے ساتھ نئی تحریک کی قدر کرتے ہیں۔ ان میں سے جو لوگ زیادہ باہمت اور جری ہوتے ہیں وہ کھل کر میدان میں آجاتے ہیں۔ مگر جو کمزور ہوتے ہیں وہ چھپ کر اسے تقویت پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں۔

دنیا کی کوئی دعوت اور کوئی تحریک بھی اپنے ان مخالفین اور موافقین کے موقف اور ان کی قوت و طاقت کو پوری طرح سمجھے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کسی دعوت کے علمبرداروں کو یہ معلوم نہ ہو کہ اُن کی راہ میں کونسے سنگِ گراں حائل ہیں اور اُن کی قوت و طاقت کے سرچشمے کہاں کہاں ہیں، اس وقت تک وہ کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتے۔ اس بنا پر ان سارے طبقوں کے مزاج، ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پوری طرح نگاہ میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ آج جو لوگ دنیا میں اسلامی نظام کے قیام کے لیے کوشاں ہیں انہیں مقصد کے واضح شعور اور نصب العین کی سچّی اور گہری لگن کے ساتھ یہ حقائق بھی پوری طرح معلوم ہونے چاہییں کہ کونسے گروہ اور طبقے اُن کی راہ میں پہاڑ بن کر کھڑے ہونگے اور کونسے لوگ ان کی تقویت کا ذریعہ بنیں گے۔

دعوتِ خیر کی مخالفت اور موافقت میں اُٹھنے والے مختلف طبقے دَورِ جدید کی پیداوار نہیں ہیں انسان نے جس روز سے اجتماعی زندگی کا آغاز کیا ہے اسی وقت سے یہ دونوں قسم کے عناصر انسانی معاشرے میں موجود رہے ہیں۔ البتہ اب ایک فرق یہ ضرور واقع ہُوا ہے کہ مخالف طبقوں اور گروہوں کا دباؤ اور اُن کے اثر کا دائرۂ کار اتنا بڑھ گیا ہے کہ اس کی نظیر پہلے کہیں نہیں ملتی۔ کُلیت پسند ریاستوں کے اندر تو یہ دباؤ فطری طور پر زیادہ ہی ہونا چاہیے۔ مگر جمہوری معاشروں میں بھی یہ دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ سطح بین آنکھیں اس کا اندازہ نہیں کر سکتیں۔ اور پھر اس کی نوعیت اتنی پیچیدہ اور اس کے اثرات اتنے ہمہ گیر ہوتے ہیں کہ ایک قدم

بھی سخت مزاحمت کے بغیر آگے بڑھنا ناممکن نہیں ہوتا۔ مختلف مراحل اور منازل کا تو ذکر ہی کیا، یہاں تو ایک ایک انچ پر پوری قوت سے راستہ مسدود کیا جاتا ہے اور شدید کشمکش اور سخت محنت کے بعد ہی کہیں آگے بڑھنے کی راہ ملتی ہے۔ کسی تحریک کی مزاحمت میں جو یہ غیر معمولی شدت اور قوت پیدا ہو گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ سائنسی ایجادات اور اکتشافات نے انسان کو بہت زیادہ توانائی عطا کر دی ہے۔ پھر حمل و نقل اور رسل و رسائل کے جدید ذرائع نے ان مختلف قوتوں کو مجتمع کرنے اور اُن سے فائدہ اٹھانے میں انسان کی معاونت کی ہے۔ چنانچہ اب مخالف قوتیں زیادہ قوت کے ساتھ کسی تحریک کے راستے میں مزاحم ہو سکتی ہیں۔

ان صفحات میں ہم اُن قوتوں کا جائزہ لیتے ہیں جو نہ صرف یہاں بلکہ پوری دنیائے اسلام میں اسلامی نظام کی راہ میں مزاحم ہیں۔ جدید سیاست اور معاشرت کی اصطلاح میں ان قوتوں کو فشاری گروہ (PRESSURE GROUPS) یعنی مخالفت میں دباؤ ڈالنے والے گروہ کہا جاتا ہے

اسلام کے معاندین کے متعدد گروہوں میں سب سے نمایاں گروہ اُن لوگوں کا ہے جو جدید تہذیب کے دل و جان سے فدائی ہیں۔ اسی کے اساسی تصورات کو وہ صحیح سمجھتے ہیں۔ اسی کے اصولوں کی صحت کے وہ قائل ہیں اور اس بات کا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اسی تہذیب میں انسانیت کی فلاح و کامرانی کا راز مضمر ہے۔ لیکن چونکہ یہ لوگ اتنے باہمت اور صاحبِ عزم نہیں ہیں، نہ اتنی قابلیت رکھتے ہیں کہ دلیل کے زور سے مسلمانوں کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل کر سکیں، اس لیے ان کا طریقہ یہ ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسندِ اقتدار حاصل کر کے در پردہ اپنے افکار و نظریات کا پرچار کریں اور جہاں جہاں مغربی اقدارِ حیات کے عملی نفاذ کے مواقع حاصل ہوں، وہاں انہیں زبردستی نافذ کر دیں۔ یہ گروہ اسلام کی راہ چار طریقوں سے روکتا ہے:

پہلا طریق یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے بارے میں مختلف شکوک و شبہات پھیلائے جائیں۔ اسلام نے ہمیں معتقدات، اعمال اور اخلاق کا جو جامع نظام دیا ہے اس کے متعلق غلط فہمیاں پیدا کی جائیں۔ خصوصاً اسلامی تعلیمات کے وہ حصے جو مغربی تہذیب سے براہِ راست متصادم ہیں اُن پر تو دل کھول کر بے دے کی جاتی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ جب ان اجزاء کے متعلق لوگوں کے اندر غلط اور ناقابلِ عمل ہونے کا تصور بیٹھ جائے گا

تو پھر باقی نظام پر بھی اُن کا اعتماد باقی نہ رہے گا اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے کہ یہ دین کسی قادرِ مطلق اور علیم و خبیر ہستی کی طرف سے راہِ ہدایت نہیں بلکہ انسانوں کا بنایا ہُوا ایک نظام ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ یہ گروہ اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی نظر میں بے وزن بنانے کے لیے جو مسائل اُبھار رہا ہے اُن کی نوعیت کا اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ سب کے سب وہی ہیں جو مغربی تہذیب سے مطابقت نہیں رکھتے۔ تعددِ ازواج، ثقافت، پردہ، تحدیدِ نسل، سُود اور قومی ملکیت کے علاوہ کونسا مسئلہ ہے جس پر ان لوگوں نے کبھی اظہارِ خیال کیا ہو۔ تمام مسلم ممالک میں یہی چند گنے چُنے مسائل موضوعِ سخن بنے ہوئے ہیں۔

اس گروہ کے کچھ لوگ اسلام کی مخالفت کے لیے دوسرا حربہ یہ استعمال کرتے ہیں کہ عوام کو ہر لمحہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اللہ کا دین تو بالکل صحیح اور مغربی تہذیب سے پوری طرح ہم آہنگ ہے، البتہ مُلّا اس کی جو تعبیر کرتا ہے وہ ایسی ہے کہ خواہ مخواہ تصادم کی صورت پیدا ہو جاتی ہے اور ہمیں یہ احساسِ ندامت ہونے لگتا ہے کہ ہم کسی فرسودہ دین کے ماننے والے ہیں۔ اس بنا پر یہ طبقہ اسلام کی نہایت ہی عجیب و غریب تاویلات پیش کرتا ہے اور قرآن و سنت کی نہایت واضح، ٹھوس اور محکم تعلیمات کو اس طرح توڑتا مروڑتا ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ جو لوگ یہ مذموم دھندا کر رہے ہیں انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ دین کی راہ روکنے کا یہ ایک بہترین ذریعہ ہے۔ مسلمانوں کے ذہن میں جب یہ بات بیٹھ جائے گی کہ صحیح اور غلط کا معیار صرف مغرب ہے اور اُن کا دین اس وجہ سے برحق ہے کہ اُس کی تعلیمات مغربی معیار پر پوری اترتی ہیں تو قدرتی طور پر اُن کے ذہن اس بات کی طرف منتقل ہو جائیں گے کہ جدید اقدار کے ہوتے آخر وہ کیوں ایک قدیم کتاب اور پُرانی سُنّت ہی کی طرف رجوع کریں، سیدھی طرح اُن اقدار ہی کو کیوں نہ اپنا لیں جو خوب و ناخوب کا اصل معیار ہیں۔

پھر اسی گروہ سے تعلق رکھنے والے کچھ ایسے افراد بھی ہیں جو اصول و نظریات کی بحث کے جھگڑے میں نہیں پڑتے بلکہ معاشرے میں عملاً دین سے بغاوت برپا کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ کبھی یہ نہیں کہتے کہ اسلام غلط ہے یا اس کے اصولوں میں کوئی خامی اور سقم ہے بلکہ عمل کے میدان میں مسلمانوں، خصوصاً اُن کی نوخیز نسلوں

کو اُن راہوں پر چلا دیتے ہیں جہاں جلدی ہی ان کی متاعِ ایمان چھن جاتی ہے۔ الہامی مذاہب کا سارا دارومدار نفس کی پاکیزگی اور سیرت کی پختگی پر ہوتا ہے۔ جب ایک مرتبہ انسان نفس کی غلامی اختیار کر کے اخلاقی ضابطوں کو توڑنے لگے تو پھر وہ اور جو کچھ بھی ہو جاتے، دینی نقطۂ نظر سے کسی کام کا نہیں رہتا۔ اب اس گروہ کی سرگرمیوں کا محور یہ ہوتا ہے کہ کسی طرح نوجوانوں کے اندر اخلاقی حس کو ختم کیا جائے اور انہیں یہ بتایا جائے کہ مذہب نے تمہاری نفسانی خواہشات کی تکمیل کی راہ میں جو پابندیاں لگا رکھی ہیں یہ بیکار کی زنجیریں ہیں جنہیں تمہیں جلدی توڑ ڈالنا چاہیے ورنہ تم ذہنی اور جذباتی عوارض کے شکار ہو جاؤ گے۔ اس طبقے کا کام یہ ہے کہ وہ ہر اس ہنگامے کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں اخلاقی آوارگی کے رجحانات کو تقویت حاصل ہو۔ مخلوط تعلیم، مخلوط مجالس، بے پردگی کی حوصلہ افزائی، رقص و سرود کی محفلوں کا قیام، طرح طرح کے جشن۔ سب اسی طبقے کی کارفرمائیاں ہیں۔ نوجوانوں پر یُوں بھی جذبات کا غلبہ ہوتا ہے۔ خصوصاً جب سفلی جذبات کو بھڑکانے کے سارے سامان موجود ہوں اور برسرِ اقتدار اور اونچے طبقے عملی طور پر اخلاق سوز تحریکات کی پشت پناہی کر رہے ہوں تو نوخیز نسلیں جلد ہی آبرو باختہ ہو کر نفس پرستی کا شیوہ اختیار کر لیتی ہیں۔

جب ہم اسلام دشمن قوتوں کی کامیابی کا جائزہ لیتے ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ انہیں سب سے زیادہ اسی محاذ پر کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ فکر و نظر کے اعتبار سے یہ لوگ مسلمانوں کو بالعموم مغربی تہذیب کا غلام نہیں بنا سکے۔ ان کی تجدد پسندی کے کارنامے بھی مسلم عوام میں مقبول نہیں ہو سکے۔ البتہ نوجوانوں کا مزاج بگاڑنے اور انہیں عیش پرستیوں کا خوگر بنانے میں ان کی کوششیں کافی حد تک بارآور ہوئی ہیں۔

اسلام کا یہ دشمن گروہ کس کس جگہ پایا جاتا ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کا اصل مسکن ایوانِ اقتدار ہے یا اس کے سائے میں بعض دوسرے مراکز۔ یہ مسلم قوم کا تاریخی المیہ ہے کہ وہ بگڑے ہوئے اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں ایک مدتِ دراز سے بے بس چلی آ رہی ہے۔ میں یہاں ماضی کی تاریخ دہرانا نہیں چاہتا۔ حال ہی میں اس کا جس طرح تسلط قائم ہوا ہے صرف اُسے بیان کرنا چاہتا ہوں۔ مسلمان ممالک جب اپنی داخلی کمزوریوں کی وجہ سے مغربی استعمار کے سامنے سرنگوں ہوئے تو غیر ملکی استعمار نے اپنے غلبے کے

بقا کے لیے یہ ضروری سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے اندر سے ایک ایسا گروہ تلاش کیا جائے جسے دنیوی مفادات دنیا کی ہر دوسری چیز سے عزیز تر ہوں۔ پھر ان میں سے بھی اُن لوگوں کو ترجیح دی گئی جن کے ذہنوں پر مغربی تہذیب کی برتری کا نقش گہرا ثبت ہو گیا ہو۔ کیونکہ ان لوگوں کی وفاداریاں مغربی استعمار کے لیے زیادہ قابلِ اعتماد تھیں۔ اس لیے یہ گروہ غیر ملکی اقتدار کے سائے میں قوت حاصل کرتا رہا اور صورتِ حال یہ ہو گئی کہ اسے اگرچہ عوام میں کبھی مقبولیت حاصل نہ ہوتی مگر امورِ مملکت میں اُسے ہمیشہ بہت زیادہ دخل حاصل رہا۔ دوسری جنگِ عظیم کے بعد جب مغربی اقوام مسلم ممالک سے سیاسی تسلط ختم کرنے پر مجبور ہوئیں تو وہ جاتی دفعہ زمامِ اقتدار اس گروہ کے ہاتھ میں سونپ گئیں تاکہ وہ ان کی غیر حاضری میں ان کی جانشینی کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کرتا رہے۔ اِدھر یہ گروہ بھی اس حقیقت سے پوری طرح واقف ہے کہ اسے معاشرے میں جو قوت حاصل ہے اس کی وجہ اس کی ذاتی عظمت یا اہلیت نہیں بلکہ محض اقتدار ہے۔ اس لیے اس نے ہمیشہ اس امر کی کوشش کی ہے کہ کسی نہ کسی طرح مسندِ اقتدار پر براجمان رہے اور پھر اقتدار کے لامحدود ذرائع سے کام لے کر اپنے دلپسند افکار کو عوام میں پھیلائے۔ اس گروہ کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہے کہ اگر مسلم ممالک میں اسلامی نظام نافذ ہو گیا تو اسے دولت سمیٹنے اور اپنی کبریائی کے ٹھاٹھ جمانے اور اپنے نظریات کو معاشرے کے اندر پھیلانے کے مواقع حاصل نہ رہیں گے۔ صرف اقتدار کی بدولت ہی اسے معاشرے میں قوت و طاقت حاصل ہے اور وہ فکری لحاظ سے بھی اپنی قیادت کی دکان اسی ذریعہ سے چمکا سکتا ہے۔ اگر مسلم ممالک میں دین غالب ہو جائے تو پھر لامحالہ وہی لوگ آگے آئیں گے جو دینی نقطۂ نظر سے مملکت کے معاملات چلانے کی زیادہ سے زیادہ اہلیت رکھتے ہوں اور ذہنی اور فکری قیادت بھی اُن حضرات کے ہاتھ میں ہو گی جو گہری دینی بصیرت کے حامل ہوں۔ اس حالت میں اگر یہ لوگ اپنی قیادت برقرار رکھنا چاہیں گے تو انہیں فکری اور اخلاقی لحاظ سے خود اپنے آپ کو بدل ڈالنا ہو گا جسے یہ اپنے حق میں موت سے بدتر سمجھتے ہیں۔

اس طبقے میں پھر دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک گروہ مغرب کے سرمایہ دارانہ نظام کا حامی ہے اور وہ دنیائے اسلام کو انگلستان، امریکہ اور فرانس کی صورت میں دیکھنے کا آرزومند ہے۔ دوسرا طبقہ اشتراکیت کا

معتقد ہے اور وہ مسلم ممالک کو رُوس یا چین کا نمونہ بنانا چاہتا ہے۔ جہاں تک مغربی دنیا کا تعلق ہے، اس کے اندر تو سرمایہ داری اور اشتراکیت کے درمیان سخت جاں گسل کشمکش برپا ہے۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ مسلم ممالک کے معاملہ میں مغربی بلاک اور اشتراکی بلاک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ خوب تعاون کر رہے ہیں، حتیٰ کہ مغربی بلاک نے شرقِ اوسط اور جنوبی عرب کو خود روس کی گود میں پھینکا ہے۔ دوسری طرف ہم یہ دلچسپ منظر بھی دیکھ رہے ہیں کہ خود مسلم ممالک میں بھی مغربی نظریات رکھنے والے عناصر اور اشتراکیت کے حامی اسلام کے مقابلے میں پُوری طرح متحد ہیں اور ایک دوسرے کے ہمرکاب ہو کر کام کر رہے ہیں۔ یہاں روسی اشتراکیت، چینی اشتمالیت اور سرمایہ دارانہ الحاد سب مل کر اسلام کے خلاف صف آرا ہیں اور ان کی صفوں میں اس محاذ پر کوئی اختلاف نظر نہیں آتا بلکہ پُورا پُورا تعاون پایا جاتا ہے۔ تعلیم گاہوں میں اسلام کی حمایت کیجیے تو ہنگامہ برپا ہو جاتا ہے مگر ماؤ کی لال کتاب اور ماؤ کی تصویر کے تمغے آزادی سے تقسیم کیے جاتے ہیں۔ مقابلے کے امتحانات میں ایک امیدوار کی بے دینی خواہ سرخ ہو یا سفید یا زرد، ہر حال میں یکساں قابلِ قبول ہے، مگر مسلمان ہونے کی ابتدائی علامات بھی اس میں پائی جائیں تو بالاتفاق اسے نااہل قرار دے دیا جاتا ہے۔ پریس اور اطلاعات اور نشریات کے شعبوں میں مغربی بلاک کے حامیوں نے بڑے ٹھنڈے دل سے سرخوں کو نفوذ کا پُورا موقع دیا ہے یہی حالت ان اخبارات کی بھی ہے جنہیں سرکاری سرپرستی حاصل ہے۔ دونوں گروہوں کے صحافی ان میں پُورے اتحاد و تعاون کے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ یہ کھلی کھلی علامات صاف بتا رہی ہیں کہ اسلام کے خلاف دونوں کا مفاد مشترک ہے اور اس معاملہ میں ان کے درمیان درحقیقت کوئی نزاع نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اسلام کی محبت مسلمانوں کے دل و دماغ میں اتنی گہری پیوست ہے اور اسلامی نظام کے ساتھ اُن کا جذباتی لگاؤ اتنا شدید ہے کہ جب تک پوری قوت مجتمع کر کے اسے ختم کرنے کی کوشش نہ کی گئی اس وقت تک اس کی جڑوں کو اکھیڑا نہیں جا سکتا۔ اس لیے اس مرحلے پر دونوں طبقوں میں پُوری پُوری یگانگت ہے۔ بلکہ انہوں نے اپنے اس محاذ کو مضبوط بنانے کے لیے ان تمام چھوٹی بڑی قوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کی کوشش کی ہے جو کسی طرح بھی اسلامی نظام

کی راہ میں حائل ہوسکتی ہیں۔ اس وقت ان کی کوششوں کا ہدف صرف یہ ہے کہ مسلمان کسی طرح اپنے مرکز ثقل سے ہٹ جائیں۔ کیونکہ اگر ایک مرتبہ وہ اس مقام سے سرک گئے تو پھر انہیں کسی بھی سمت میں بڑی آسانی کے ساتھ دھکیلا جاسکتا ہے۔ چنانچہ دیکھیے کہ ان طبقوں میں اُن تمام افراد اور گروہوں کی پذیرائی کی جاتی ہے جن کے افکار و نظریات میں لادینی اقدار کی جھلک ہو یا جو امت کے اجتماعی تصوّرات سے مغایرت رکھتے ہوں اسی اصول کے تحت ہر اسلامی ملک میں اس وقت ہر گمراہی کی سرپرستی ہو رہی ہے۔ جو گروہ بھی کسی نہ کسی طرح دین کا حلیہ بگاڑنے، یا اہلِ دین کو ذلیل و خوار کرنے کے لیے کام کر رہا ہو، اسے نہ صرف اپنے افکار پھیلانے کی سہولتیں بہم پہنچائی جاتی ہیں بلکہ حکومت اپنے ذرائع سے بھی ہر طرح اس کی ہمت افزائی کرتی ہے۔

اسلام کی راہ روکنے والا یہ سب سے مؤثر طبقہ مزاحمت کے لیے متعدد محاذ کھولتا ہے۔ ان میں سے ایک گروہ تو براہِ راست حکومت کے اندر گھس کر اور وہاں اثر و رسوخ پیدا کرکے دینی قوتوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے دباتا ہے اور دوسرا گروہ عوام کے اندر مختلف حیلوں بہانوں سے اثر و نفوذ پیدا کرتا ہے جس ملک میں آمرانہ نظام قائم ہو وہاں تو اسے کام کرنے کے نہایت ہی اچھے مواقع میسر آتے ہیں۔ ایک ایسی حکومت جو عوامی آرزوؤں اور تمناؤں کی ترجمان نہ ہو اور ایک فرد یا چند افراد یا ایک مخصوص گروہ کی خواہشات کی مظہر ہو، وہ اپنے تسلط کے لیے ہر مرحلہ پر انتظامیہ کی محتاج رہتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُس ملک میں نوکرشاہی کو غیر محدود اختیارات حاصل ہو جاتے ہیں اور وہ جس نہج پر چاہتی ہے ملک کو چلاتی ہے ملک کی پوری آبادی اس کے ہاتھ میں بالکل بے بس ہوتی ہے، عوامی خواہشات کے علی الرغم مسندِ اقتدار پر قابض ہونے والوں کو اس بات کی فکر سب سے زیادہ دامنگیر رہتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی اقبال مندی، مقبولیت اور محبوبیت کی خوش کُن خبریں سُنتے رہیں۔ اسلام کا مُعاند طبقہ ان کی اس کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ انہیں ہر وقت ان کی ہر آن بڑھتی ہوئی ہر دلعزیزی کے افسانے سنا سنا کر مطمئن اور مسرور رکھتا ہے اور انہیں یہ ذہن نشیں کراتا ہے کہ یہاں اگر کوئی اُن کا بدخواہ ہے تو یہی دین کے رجعت پسندانہ نظریات رکھنے والا گروہ ہے۔ باقی ہر شخص اُن کی ترقیات اور اُن کی عظمت کا دل سے معترف ہے اور اس بات کا آرزو مند

ہے کہ ان جیسے بالغ نظر اور خیر خواہ حکمران قیامت تک مسندِ اقتدار کی زینت بنے رہیں ۔ یہ نوکر شاہی طبقہ حکمرانوں کی کسی مخلصانہ محبت اور عقیدت میں یہ طرزِ عمل اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنے مفادات کی خاطر اس روش کو اپناتا ہے ۔ اُسے اچھی طرح معلوم ہوتا ہے کہ اگر حکومت عوامی احساسات کی ترجمان ہو تو پھر اُسے عوام کا خادم بنے بغیر کوئی چارہ نہیں لیکن موجودہ صورت میں اگر وہ مدح و ستائش کے ذریعے آقائے ولی نعمت کو خوش رکھنے میں کامیاب ہو جائے تو وہ من مانی کارروائیاں کر سکتا ہے اور کسی میں یہ ہمت نہیں ہو سکتی کہ اُس کا ہاتھ روکے ۔ یہ گروہ بالکل بے خوف ہو کر لوگوں کی گردنوں پر مسلط ہوتا ہے اور انہیں اپنے ظلم کا تختۂ مشق بناتا ہے مگر اس کے ساتھ وہ ہر لحظہ اس بات کا بھی اہتمام کرتا ہے کہ حکمران گروہ کو عوامی احساسات سے زیادہ سے زیادہ بے خبر رکھا جائے اور ملک کے حالات اور عوام کے جذبات خواہ کچھ بھی ہوں مگر اُسے یہی باور کرایا جائے کہ حضور کا اقبال دن دگنی رات چوگنی ترقی کر رہا ہے ۔ یہ طبقہ حکمرانوں کو ہر وقت اس طرح گھیرے میں رکھتا ہے کہ انہیں ان کی وساطت کے بغیر کوئی خبر ملتی ہی نہیں اور وہ جلدی ہی اپنے آپ کو اس کے ہاتھ میں بے دست و پا محسوس کرتے ہیں ۔ اس کا منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ مسندِ اقتدار سنبھالنے والے آخر کار برائے نام حکمران بن کر رہ جاتے ہیں اور اقتدار کی اصل قوت اس نوکر شاہی طبقے کے ہاتھ میں منتقل ہو جاتی ہے ۔ اس قوت کو پھر یہ طبقہ بڑی عیاری کے ساتھ دین کے خلاف استعمال کرتا ہے ۔

دین حق کا یہ مخالف طبقہ عوام کے اندر بھی اسلام کے خلاف مختلف قسم کے محاذ قائم کرتا ہے ۔ ان میں سے کوئی الحاد و بے دینی کے فلسفے پھیلاتا ہے اور عقائد و احکام میں شکوک برپا کرتا ہے ۔ اس کا رُخ ہمارے تعلیم یافتہ طبقوں کی طرف ہوتا ہے ۔ کوئی مذہبی گمراہیاں پھیلاتا ہے اور اس کے شکار وہ لوگ ہوتے ہیں جو دین کا علم تو نہیں رکھتے مگر اس سے دلچسپی ضرور رکھتے ہیں ۔ کوئی اخلاقی بگاڑ پھیلانے میں سرگرمی دکھلاتا ہے اور اس کے ہدف خاص طور پر ہمارے نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں دونوں) ہوتے ہیں ۔ کوئی مزدوروں کا خیر خواہ بن کر سامنے آتا ہے اور انہیں طبقاتی جنگ کی طرف دھکیلتا ہے ۔

کوئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کا رُخ کرتا ہے اور وہاں طلبہ کو گمراہ کرتا ہے۔ لیکن اس طبقہ کے حربوں میں سب سے زیادہ گھٹیا اور ذلیل حربہ یہ ہے کہ وہ دینِ حق کی خاطر جد وجہد کرنے والوں کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈے کا ایک طوفان برپا کرتا ہے، اور اس افترا پردازی کی مہم کا سب سے زیادہ شرمناک پہلو یہ ہے کہ اس ناپاک کام میں اس کے آلۂ کار وہ لوگ بنتے ہیں جو اپنے آپ کو علمائے دین و مفتیانِ شرعِ متین کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے ذریعہ سے دینی تحریک اور اس کے علمبرداروں کو بدنام کیا جاتا ہے۔ اُن پر طرح طرح جھوٹے الزامات عائد کیے جاتے ہیں اور عوام کو یقین دلایا جاتا ہے کہ دین کو اصل خطرہ فسّاق و فجّار سے نہیں، لادینی کے علمبرداروں سے نہیں، مغربی تہذیب کے پھیلانے والوں سے نہیں، اشتراکیت کے داعیوں سے نہیں، باہر سے آنے والی اور خود ملک کے اندر سے اٹھنے والی کسی گمراہی سے نہیں، خطرہ ہے تو صرف اُن لوگوں سے جو دین کو پُورے نظامِ زندگی کی حیثیت سے غالب کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دوسری طرف اس طبقے کے وہ عناصر جو ایوانِ اقتدار میں گھسے ہوئے ہیں، وہ حکومت کو دینی تحریکات کے علمبرداروں کے خلاف برانگیختہ کرتے ہیں اور مسندِ اقتدار پر متمکن افراد کو یہ خوف دلاتے ہیں کہ یہ لوگ تمہاری گدی چھین لینا چاہتے ہیں، اس بنا پر یہ تمہارے سب سے بڑے دشمن ہیں جن کا انہیں جلد از جلد قلع قمع کرنا چاہیے۔ عوامی احساسات سے بے خبر اور صحیح صورتِ حال سے غافل حکمراں ان کے فریب میں آکر ظلم و ستم ڈھانا شروع کرتے ہیں اور اس سے اُن کے خلاف عوام کے اندر بیزاری کے جو جذبات پھیلتے ہیں ان سے فائدہ اٹھاکر یہ بے دین طبقہ اربابِ اقتدار کو یقین دلاتا ہے کہ تمہارے اقتدار کے لیے اگر کوئی سہارا ہے تو وہ بس ہماری ذات ہے۔

انڈونیشیا، مصر، شام میں اسی انداز سے یہ دشمنِ دین طبقہ اسلام کی راہ میں مزاحم ہُوا ہے اور پاکستان میں بھی اس نے یہی روش اختیار کر رکھی ہے۔ حکومت کے ایوانوں میں اسے پُوری رسائی حاصل ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ امورِ مملکت اسی کے منشا کے مطابق چلائے جا رہے ہیں تو یہ بات زیادہ صحیح ہوگی حکمرانوں کے مزاج میں بہت زیادہ دخیل ہونے کی وجہ سے وہ جس طرح چاہتا ہے اپنی مرضی کو عوام پر مسلط کر دیتا ہے۔ دوسری طرف عوام کے اندر بھی اسے رسوخ پیدا کرنے کے پُورے مواقع دیئے جا رہے ہیں۔

مزدوروں میں کام کرنے کا گویا اسے اجارہ ملا ہوا ہے۔ طلبہ کو خراب کرنے کی بھی اسے کھلی چھٹی دے دی گئی ہے۔ نشرو اشاعت کے تمام ذرائع بھی اب زیادہ تر اسی کے ہاتھ میں ہیں۔ اس کے مقابلے میں دین کے لیے کام کرنے والے عوام سے رابطہ پیدا کرنے کی جو صورت بھی اختیار کرتے ہیں اس پر فوراً خطرے کی گھنٹی بجنی شروع ہو جاتی ہے اور پوری انتظامی مشینری ان کے راستے میں رکاوٹیں ڈالنے کے لیے حرکت میں آجاتی ہے۔

یہ سب تجربات اس سے پہلے متعدد مسلم ممالک میں ہو چکے ہیں اور قریب کے زمانے میں ان کے بدترین نتائج بھی دیکھے جا چکے ہیں۔ اسرائیل جیسی چھوٹی ریاست کے مقابلے میں کئی کئی عرب ریاستوں کے بیک وقت شکست کھا جانے کا سبب آخر اس کے سوا کیا تھا کہ ۲۰ سال تک اسرائیل یہودی قومیت کی اصل بنیادوں پر اپنی طاقت کی تعمیر کرتا رہا اور دوسری طرف عرب ریاستوں میں اسلامی عقائد، اسلامی تہذیب اور اسلامی اخلاق کی جڑیں کھوکھلی کی جاتی رہیں۔ ایک بیرونی تہذیب اور بیرونی فلسفۂ حیات کو لا کر زبردستی مسلمانوں پر ٹھونسنے کی کوشش کی جاتی رہی اور جن لوگوں نے بھی اسلام کے احیاء کیلیے کوئی کوشش کی انہیں کچلنے کے لیے ساری طاقتیں خرچ کی جاتی رہیں۔ اس کا جو عبرتناک انجام جون ۶۷ء میں ساری دنیا کے سامنے آیا ہے اس کے بعد بھی اگر کچھ مزید مسلمان ملک یہی تجربہ دہرانا چاہیں تو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ فَاِنَّھَا لَا تَعْمَی الْاَبْصَارُ وَلٰکِنْ تَعْمَی الْقُلُوْبُ الَّتِیْ فِی الصُّدُوْرِ۔

یہ تو ہے اس طبقہ کا معاملہ جو دعوتِ خیر کا اصل مدِمقابل ہے۔ مگر اسلام کے خلاف اس سب سے بڑے اور سب سے زیادہ طاقتور طبقے کے علاوہ کچھ دوسرے طبقات بھی دین کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں۔ ان میں سب سے اہم طبقہ سرمایہ داروں اور دولتمندوں کا ہے، خصوصاً وہ سرمایہ دار اور دولت مند جن کی دولت حکومت کی غلط بخشیوں کا نتیجہ ہے۔ ترقی پذیر ممالک کے اندر چونکہ طلب کے مقابلے میں اشیاء کی رسد بہت کم ہوتی ہے اور جن لوگوں کو بھی رسد کی آسانیاں حاصل ہو جائیں وہ برسوں میں نہیں بلکہ دنوں میں دولت کی غیر معمولی مقدار سمیٹنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں، اس لیے یہاں ہر شخص کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ حکومت اُسے دولت سمیٹنے کی زیادہ سے زیادہ آسانیاں بہم پہنچائے اور پھر حصولِ دولت کے ناجائز طریقوں میں اس کا قطعاً احتساب نہ کرے۔ درحقیقت دولت پرستی کے اس بڑھتے ہوئے جنون نے لوگوں کی اچھی خاصی تعداد کو بے ضمیر بنا دیا ہے

اور مال و متاع کی خاطر یہ لوگ ہر حکومت کی خوشامد اور اُس کے ہر جائز و ناجائز فعل میں اُس کی حمایت پر کمر بستہ ہو جاتے ہیں۔ دورِ جدید میں یُوں بھی صنعت و تجارت کے سارے معاملات میں حکومتیں کافی حد تک دخیل ہو گئی ہیں۔ لیکن خاص طور پر ترقی پذیر ممالک میں تو کاروبار کا اکثر و بیشتر حصہ لائسنسوں، پرمٹوں اور اسی نوعیت کی دیگر مراعات سے وابستہ ہوتا ہے، اس لیے ایسے ممالک میں معیشت پر حکومت کی مکمل اجارہ داری قائم ہو جاتی ہے۔ یہاں جو شخص بھی ذرا وسیع پیمانے پر تجارت یا کاروبار کرنا چاہتا ہو وہ حکومت کی چشمِ التفات کا محتاج ہوتا ہے اور وہ اُس کی برہمی کو ایک ثانیہ کے لیے بھی گوارا نہیں کر سکتا۔ مسلم ممالک کے حکمرانوں نے اس صورتِ حال سے پُورا پُورا فائدہ اٹھایا ہے اور اس ذریعہ سے عوام کو طالع آزمائی، موقع پرستی اور بے ضمیری کی خوب تربیت دی ہے۔ اس طرح دولت پرستی کے جنون نے بکثرت لوگوں کو دنیا و مافیہا سے غافل کر دیا ہے اور وہ باطل نظام کا ساتھ دینے کے لیے ہر وقت تیار رہتے ہیں جو ان کی اس معاملے میں معاونت و دستگیری کرتے۔

پھر دولت پرستوں کے اندر بھی دو طبقے پائے جاتے ہیں۔ ایک بڑا طبقہ اُن لوگوں کا ہے جن کو ناجائز ذرائع سے حاصل کی ہوئی دولت نے عیش پرستیوں کی راہ پر ڈال دیا ہے۔ اس طبقہ کو ہمیشہ ایک ہی فکر لاحق رہتی ہے کہ حکمرانوں کی مدح و ستائش کر کے زیادہ سے زیادہ لائسنس اور پرمٹ حاصل کیے جائیں اور بغیر کسی محنت کے مال و متاع کی ایک کثیر مقدار جمع کر کے اُسے عیاشیوں پر اڑایا جائے۔ اس طبقے کو اسلام، اخلاق، ضمیر کسی چیز سے بھی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے صرف اپنے نفس کی لذتوں کے لیے دولت چاہیے۔

دوسرا مختصر سا طبقہ اُن افراد پر مشتمل ہے جو کچھ نہ کچھ دینی ذہن بھی رکھتے ہیں، اسلام کے شعائر کی عزت بھی کرتے ہیں، اور کسی حد تک اسلام کے بنیادی ارکان کے پابند بھی ہوتے ہیں، مگر دولت کی محبت میں کوئی ایسا قدم اٹھانا نہیں چاہتے جس سے حکومت کی نظرِ عنایت ان سے پھر جائے اور اُن کی آمدنی کے ذرائع میں کوئی کمی واقع ہو جائے۔ اس طبقے کو بھی پہلے طبقے کی طرح لائسنس اور پرمٹ کی فکر ہمیشہ دامنگیر رہتی ہے اور اس کی خاطر وہ حکومت کے ہر جائز و ناجائز کام میں اس کی معاونت کرتا ہے۔ اس کے ساتھ

جب ان لوگوں کے اندر مذہبی حس بیدار ہوتی ہے تو یہ مساجد کی تعمیر، عربی مدارس کے قیام اور ان کی اعانت، اور غریبوں اور بیواؤں کی امداد کے لیے کچھ صدقات بھی دے دیتے ہیں۔ لیکن کسی ایسے دینی کام کا ساتھ وہ کبھی نہیں دیتے جس سے اُن کی ناجائز آمدنیوں پر زد پڑنے کا خطرہ ہو۔ حکمراں طبقے کو بھی جب اپنی مصلحتوں کے تحت کسی دین دار گروہ کی حوصلہ افزائی مقصود ہوتی ہے تو وہ بھی انہی لوگوں سے اس کی اعانت کراتا ہے تاکہ براہِ راست سرکاری مدد سے کر اس کی پوزیشن مشتبہ نہ ہونے پائے، اور اپنا دینی بھرم قائم رکھتے ہوئے وہ حکمران طبقے کی خدمت زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام دے سکے۔

اس گروہ کے بلاشبہ کچھ فائدے بھی ہیں۔ مساجد اور مدارس کا نظام انہی کی فیاضیوں سے چل رہا ہے لیکن اس طبقے کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ اس سے اسلام کا ہمہ گیر تصور مجروح ہوتا ہے جن لوگوں کو دین سے گہری واقفیت نہیں ہوتی وہ اسی نہج پر سوچنے لگتے ہیں کہ اللہ کو راضی کرنے کے لیے یہی کافی ہے کہ مساجد اور مدارس کی تعمیر میں حصہ لیا جائے اور نماز اور روزے اور حج اور زکوٰۃ کی کسی حد تک پابندی کر لی جائے۔ باقی رہے دولت کمانے کے ناجائز ذرائع، معاشرے کا اخلاقی بگاڑ، مظلوموں اور کمزوروں پر ظالموں کی دراز دستیاں، اور نظامِ حکومت کی وہ خرابیاں جن کی بدولت ایک غیر اسلامی تہذیب فروغ پا رہی ہے، تو یہ "سیاست" کی باتیں ہیں جن سے تعرض کرنا خدا کو راضی کرنے کے لیے ضروری نہیں ہے۔ ان سے کوئی دلچسپی لیے بغیر وہ دولت کے حصول کے لیے ہر طرح کے ناجائز ذرائع استعمال کرنے میں منہمک ہو جاتے ہیں اور حکومت اگر انہیں یہ آسانیاں بہم پہنچاتی رہے تو اس کی حمایت پر ہمیشہ کمربستہ رہتے ہیں۔ یہ لوگ براہِ راست تو دین کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتے لیکن ان کے طرزِ عمل سے دین کو اچھا خاصا نقصان پہنچتا ہے

ایک اور طبقہ وہ ہے جو محض اپنی چودھراہٹ کی خاطر برسرِ اقتدار طبقوں کے ساتھ مل کر دین کی راہ روکتا ہے۔ اِس طبقے میں سوائے جوڑ توڑ کے اور کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ یہ ہر چڑھتے ہوئے سورج کا پرستار بن کر معاشرے میں عزت کا مقام حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کرتا ہے۔ اس کا کوئی ضمیر اور ایمان نہیں ہوتا اور اس کا قبلہ ہر وقت بدلنے کے لیے تیار رہتا ہے۔ عوام بھی اس کی قدر و قیمت اچھی طرح پہچانتے ہیں اور

(باقی ص ۱۶۳ پر)

تفہیم القرآن

الحشر

(۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ سے ڈرو، اور ہر شخص یہ دیکھے کہ اُس نے کل کے لیے کیا سامان کیا ہے۔ اللہ سے ڈرتے رہو، اللہ یقیناً تمہارے اُن سب اعمال سے باخبر ہے جو تم کرتے ہو۔ اُن

قرآن مجید کا قاعدہ ہے کہ جب کبھی منافق مسلمانوں کے نفاق پر گرفت کی جاتی ہے تو ساتھ ساتھ انہیں نصیحت بھی کی جاتی ہے تاکہ ان میں سے جس کے اندر بھی ابھی کچھ ضمیر کی زندگی باقی ہے وہ اپنی اس روش پر نادم ہو اور خدا سے ڈر کر اُس گڑھے سے نکلنے کی فکر کرے جس میں نفس کی بندگی نے اسے گرا دیا ہے۔ یہ پورا رکوع اسی نصیحت پر مشتمل ہے۔

۹ کل سے مراد آخرت ہے۔ گویا دنیا کی یہ پوری زندگی "آج" ہے اور "کل" وہ یوم قیامت ہے جو اس آج کے بعد آنے والا ہے۔ یہ انداز بیان اختیار کر کے اللہ تعالیٰ نے نہایت حکیمانہ طریقہ سے انسان کو یہ سمجھایا ہے کہ جس طرح دنیا میں وہ شخص سخت نادان ہے جو آج کے لطف و لذت پر اپنا سب کچھ لٹا بیٹھتا ہے اور نہیں سوچتا کہ کل اس کے پاس کھانے کو روٹی اور سر چھپانے کو جگہ بھی باقی رہے گی یا نہیں، اسی طرح وہ شخص بھی اپنے پاؤں پر خود کلہاڑی مار رہا ہے جو اپنی دنیا بنانے کی فکر میں ایسا منہمک ہے کہ اپنی آخرت سے بالکل غافل ہو چکا ہے، حالانکہ آخرت ٹھیک اسی طرح آنی ہے جس طرح آج کے بعد کل آنے والا ہے، اور وہاں وہ کچھ نہیں پا سکتا اگر دنیا کی موجودہ زندگی میں اس کے لیے کوئی پیشگی سامان فراہم نہیں کرتا۔ اس کے ساتھ دوسرا حکیمانہ نکتہ یہ ہے کہ اس آیت میں ہر شخص کو آپ ہی اپنا محتسب بنایا گیا ہے۔ جب تک کسی شخص میں خود اپنے بُرے اور بھلے کی تمیز پیدا نہ ہو جائے، اس کو سرے سے یہ احساس ہی نہیں ہو سکتا کہ جو کچھ وہ کر رہا ہے وہ آخرت میں اس کے مستقبل کو سنوارنے والا ہے یا بگاڑنے والا۔ اور جب اس کے اندر یہ حس بیدار ہو جائے تو اسے خود ہی اپنا حساب لگا کر یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اپنے وقت، اپنے سرمایہ، اپنی محنت، اپنی قابلیتوں اور

لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو اللہ کو بھول گئے تو اللہ نے انہیں خود اپنا نفس بھلا دیا۔[۳۰] یہی لوگ فاسق ہیں۔ دوزخ میں جانے والے اور جنت میں جانے والے کبھی یکساں نہیں ہو سکتے۔ جنت میں جانے والے ہی اصل میں کامیاب ہیں۔

اگر ہم نے یہ قرآن کسی پہاڑ پر بھی اتار دیا ہوتا تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دبا جا رہا ہے اور پھٹا پڑتا ہے۔[۳۱] یہ مثالیں ہم لوگوں کے سامنے اس لیے بیان کرتے ہیں کہ وہ (اپنی حالت پر) غور کریں۔

اپنی کوششوں کو جس راہ میں صرف کر رہا ہے وہ اسے جنت کی طرف لے جا رہی ہے یا جہنم کی طرف۔ یہ دیکھنا اس کے اپنے ہی مفاد کا تقاضا ہے۔ نہ دیکھے گا تو آپ ہی اپنا مستقبل خراب کرے گا۔

۳۰؎ یعنی خدا فراموشی کا لازمی نتیجہ خود فراموشی ہے۔ جب آدمی یہ بھول جاتا ہے کہ وہ کسی کا بندہ ہے تو لازماً وہ دنیا میں اپنی ایک غلط حیثیت متعین کر بیٹھتا ہے اور اس کی ساری زندگی اسی بنیادی غلط فہمی کے باعث غلط ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی طرح جب وہ یہ بھول جاتا ہے کہ وہ ایک خدا کے سوا کسی کا بندہ نہیں ہے تو وہ اُس ایک کی بندگی تو نہیں کرتا جس کا وہ درحقیقت بندہ ہے، اور اُن بہت سوں کی بندگی کرتا رہتا ہے جن کا وہ فی الواقع بندہ نہیں ہے۔ یہ پھر ایک عظیم اور ہمہ گیر غلط فہمی ہے جو اس کی ساری زندگی کو غلط کر کے رکھ دیتی ہے۔ انسان کا اصل مقام دنیا میں یہ ہے کہ وہ بندہ ہے، آزاد و خود مختار نہیں ہے۔ اور صرف ایک خدا کا بندہ ہے، اُس کے سوا کسی اور کا بندہ نہیں ہے۔ جو شخص اس بات کو نہیں جانتا وہ حقیقت میں خود اپنے آپ کو نہیں جانتا۔ اور جو شخص اِس کو جاننے کے باوجود کسی لمحہ بھی اِسے فراموش کر بیٹھتا ہے اسی لمحے کوئی ایسی حرکت اس سے سرزد ہو سکتی ہے جو کسی منکر یا مشرک یعنی خود فراموش انسان ہی کے کرنے کی ہوتی ہے۔ صحیح راستے پر انسان کے ثابت قدم رہنے کا پورا انحصار اس بات پر ہے کہ اسے خدا یاد رہے۔ اس سے غافل ہوتے ہی وہ اپنے آپ سے غافل ہو جاتا ہے، اور یہی غفلت اسے فاسق بنا دیتی ہے۔

۳۱؎ اس تمثیل کا مطلب یہ ہے کہ قرآن جس طرح خدا کی کبریائی اور اس کے حضور بندے کی ذمہ داری و جواب دہی کو صاف صاف بیان کر رہا ہے، اس کا فہم اگر پہاڑ جیسی عظیم مخلوق کو بھی نصیب ہوتا اور اسے معلوم ہو جاتا کہ اس کو کس ربِ قدیر کے سامنے اپنے اعمال کی جواب دہی کرنی ہے تو وہ بھی خوف سے کانپ اُٹھتا۔ لیکن حیرت کے لائق ہے اُس انسان کی بے حسی اور بے فکری جو قرآن کو سمجھتا ہے اور اس کے ذریعہ سے حقیقت حال جان چکا

وہ اللہ ہی ہے[۳۲] جس کے سوا کوئی معبود نہیں،[۳۳] غائب اور ظاہر ہر چیز کا جاننے والا،[۳۴] وہی رحمٰن اور رحیم ہے۔[۳۵] وہ اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ بادشاہ ہے[۳۶] نہایت مقدس،[۳۷] سراسر

ہے اور پھر بھی اس پر نہ کوئی خوف طاری ہوتا ہے، نہ کبھی اسے یہ فکر لاحق ہوتی ہے کہ جو ذمہ داریاں اس پر ڈالی گئی ہیں ان کے بارے میں وہ اپنے خدا کو کیا جواب دیگا۔ بلکہ قرآن کو سُن کر یا پڑھ کر وہ اس طرح غیر متأثر رہتا ہے کہ گویا وہ ایک بے جان و بے شعور پتھر ہے جس کا کام سننا اور دیکھنا اور سمجھنا ہے ہی نہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، جلد چہارم، الاحزاب، حاشیہ ۱۲۰)۔

[۳۲] ان آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خدا جس کی طرف سے یہ قرآن تمہاری طرف بھیجا گیا ہے، جس نے یہ ذمہ داریاں تم پر ڈالی ہیں، اور جس کے حضور بالآخر تمہیں جواب دہ ہونا ہے، وہ کیسا خدا ہے اور کیا اس کی صفات ہیں۔ اوپر کے مضمون کے بعد متصلاً صفاتِ الٰہی کا یہ بیان خود بخود انسان کے اندر یہ احساس پیدا کرتا ہے کہ اس کا سابقہ کسی معمولی ہستی سے نہیں ہے بلکہ اس عظیم و جلیل ہستی سے ہے جس کی یہ اور یہ صفات ہیں۔ اس مقام پر یہ بات بھی جان لینی چاہیے کہ قرآن مجید میں اگرچہ جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کی صفات بے نظیر طریقے سے بیان کی گئی ہیں جن سے ذاتِ الٰہی کا نہایت واضح تصور حاصل ہوتا ہے، لیکن دو مقامات ایسے ہیں جن میں صفاتِ باری تعالیٰ کا جامع ترین بیان پایا جاتا ہے۔ ایک سورۂ بقرہ میں آیت الکرسی (آیت ۲۵۵)۔ دوسرے، سورۂ حشر کی یہ آیات۔

[۳۳] یعنی جس کے سوا کسی کی یہ حیثیت اور مقام اور مرتبہ نہیں ہے کہ اس کی بندگی و پرستش کی جائے جس کے سوا کوئی خدائی کی صفات و اختیارات رکھتا ہی نہیں کہ اسے معبود ہونے کا حق پہنچتا ہو۔

[۳۴] یعنی جو کچھ مخلوقات سے پوشیدہ ہے اس کو بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ ان پر ظاہر ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اُس کے علم سے اِس کائنات میں کوئی شے بھی پوشیدہ نہیں۔ ماضی میں جو کچھ گزر چکا ہے، حال میں جو کچھ موجود ہے، اور مستقبل میں جو کچھ ہوگا، ہر چیز اس کو براہ راست معلوم ہے۔ کسی ذریعۂ علم کا وہ محتاج نہیں ہے۔

[۳۵] یعنی وہی ایک ہستی ایسی ہے جس کی رحمت بے پایاں ہے، تمام کائنات پر وسیع ہے، اور کائنات کی ہر چیز کو اس کا فیض پہنچتا ہے۔ سارے جہان میں کوئی دوسرا اس ہمہ گیر اور غیر محدود رحمت کا حامل نہیں ہے۔ دوسری جس ہستی میں بھی صفتِ رحم پائی جاتی ہے اس کی رحمت جزوی اور محدود ہے، اور وہ بھی اس کی ذاتی صفت نہیں ہے

بلکہ خالق نے کسی مصلحت اور ضرورت کی خاطر اسے عطا کی ہے جس مخلوق کے اندر بھی اس نے کسی دوسری مخلوق کے لیے جذبۂ رحم پیدا کیا ہے، اس لیے پیدا کیا ہے کہ ایک مخلوق کو وہ دوسری مخلوق کی پرورش اور خوشحالی کا ذریعہ بنانا چاہتا ہے۔ یہ بجائے خود اُسی کی رحمتِ بے پایاں کی دلیل ہے۔

۳۶؎ اصل میں لفظ اَلْمَلِكُ استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اصل بادشاہ وہی ہے۔ نیز مطلقاً اَلْمَلِك کا لفظ استعمال کرنے سے یہ مفہوم بھی نکلتا ہے کہ وہ کسی خاص علاقے یا مخصوص مملکت کا نہیں بلکہ سارے جہان کا بادشاہ ہے۔ پوری کائنات پر اس کی سلطانی و فرمانروائی محیط ہے۔ ہر چیز کا وہ مالک ہے۔ ہر شے اس کے تصرف اور اقتدار اور حکم کی تابع ہے۔ اور اس کی حاکمیت (SOVEREIGNTY) کو محدود کرنے والی کوئی شے نہیں ہے۔ قرآن مجید میں مختلف مقامات پر اللہ تعالیٰ کی بادشاہی کے اِن سارے پہلوؤں کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے:

وَلَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (الروم: ۲۶)	زمین اور آسمانوں میں جو بھی ہیں اس کے مملوک ہیں، سب اس کے تابع فرمان ہیں۔
يُدَبِّرُ الْاَمْرَ مِنَ السَّمَآءِ اِلَى الْاَرْضِ (السجدہ: ۵)	آسمان سے زمین تک وہی تدبیر امر کرتا ہے۔
لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (الحدید: ۵)	زمین اور آسمانوں کی بادشاہی اسی کی ہے اور اللہ ہی کی طرف سارے معاملات رجوع کیے جاتے ہیں۔
وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِى الْمُلْكِ (الفرقان: ۲)	بادشاہی میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔
بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَىْءٍ (یٰس: ۸۳)	ہر چیز کی سلطانی و فرمانروائی اسی کے ہاتھ میں ہے۔
فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (البروج: ۱۶)	جس چیز کا ارادہ کرے اسے کر گزرنے والا۔
لَا يُسْـَٔلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْـَٔلُوْنَ۔ (الانبیاء: ۲۳)	جو کچھ وہ کرے اس پر وہ کسی کے سامنے جوابدہ نہیں ہے اور سب جواب دہ ہیں
وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ (الرعد: ۴۱)	اور اللہ فیصلہ کرتا ہے، کوئی اس کے فیصلے پر نظرثانی کرنے والا نہیں ہے۔

وَهُوَ يُجِيرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ (المؤمنون: ۸۸) اور وہ پناہ دیتا ہے اور کوئی اس کے مقابلے میں پناہ نہیں دے سکتا۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَاءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَاءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَاءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ (آل عمران: ۲۶)

کہو، خدایا، ملک کے مالک، تو جس کو چاہتا ہے ملک دیتا ہے اور جس سے چاہتا ہے ملک چھین لیتا ہے۔ جسے چاہتا ہے عزت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ بھلائی تیرے ہی ہاتھ میں ہے یقیناً تو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اِن توضیحات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بادشاہی حاکمیت کے کسی محدود یا مجازی مفہوم میں نہیں بلکہ اس کے پورے مفہوم میں، اس کے مکمل تصور کے لحاظ سے حقیقی بادشاہی ہے۔ بلکہ درحقیقت حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اگر کہیں پائی جاتی ہے تو صرف اللہ تعالیٰ کی بادشاہی میں ہی پائی جاتی ہے۔ اس کے سوا اور جہاں بھی اس کے ہونے کا دعویٰ کیا جاتا ہے، خواہ وہ کسی بادشاہ یا ڈکٹیٹر کی ذات ہو، یا کوئی طبقہ یا گروہ یا خاندان ہو، یا کوئی قوم ہو، اسے فی الواقع کوئی حاکمیت حاصل نہیں ہے، کیونکہ حاکمیت سرے سے اُس حکومت کو کہتے ہی نہیں ہیں جو کسی کا عطیہ ہو، جو کبھی ملتی ہو اور کبھی سلب ہو جاتی ہو، جسے کسی دوسری طاقت سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہو، جس کا قیام و بقاء عارضی و وقتی ہو، اور جس کے دائرۂ اقتدار کو بہت سی دوسری متصادم قوتیں محدود کرتی ہوں۔

لیکن قرآن مجید صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کائنات کا بادشاہ ہے، بلکہ بعد کے فقروں میں یہ تصریح کرتا ہے کہ وہ ایسا بادشاہ ہے جو قدوس ہے، سلام ہے، مومن ہے، مہیمن ہے، عزیز ہے، جبار ہے، متکبر ہے، خالق ہے، باری ہے، اور مصور ہے۔

۳۷؎ اصل میں لفظ اَلْقُدُّوْس استعمال ہوا ہے جو مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اس کا مادہ قدس ہے۔ قدس کے معنی ہیں تمام بُری صفات سے پاکیزہ اور منزہ ہونا۔ اور قُدّوس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس سے بدرجہا بالا و برتر ہے کہ اس کی ذات میں کوئی عیب، یا نقص، یا کوئی قبیح صفت پائی جائے۔ بلکہ وہ ایک پاکیزہ ترین ہستی ہے جس کے بارے میں کسی بُرائی کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ قدوسیت درحقیقت حاکمیت

سلامتی[۳۸] امن دینے والا[۳۹]، نگہبان[۴۰]، سب پر غالب[۴۱]، اپنا حکم بزور نافذ کرنے والا[۴۲]، اور بڑا ہی ہو کر رہنے والا[۴۳]۔

کے اوّلین لوازم میں سے ہے۔ انسان کی عقل اور فطرت یہ ماننے سے انکار کرتی ہے کہ حاکمیت کی حامل کوئی ایسی ہستی ہو جو شریر اور بد خلق اور بد نیت ہو، جس میں قبیح صفات پائی جاتی ہوں، جس کے اقتدار سے اس کے محکوموں کو بھلائی نصیب ہونے کے بجائے بُرائی کا خطرہ لاحق ہو۔ اسی بنا پر انسان جہاں بھی حاکمیت کو مرکوز قرار دیتا ہے وہاں قدوسیت نہیں بھی ہوتی تو اسے موجود فرض کر لیتا ہے، کیونکہ قدوسیت کے بغیر اقتدارِ مطلق ناقابلِ تصور ہے۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا درحقیقت کوئی مقتدرِ اعلیٰ بھی قدوس نہیں ہے اور نہیں ہو سکتا۔ شخصی بادشاہی ہو یا جمہور کی حاکمیت، یا اشتراکی نظام کی فرمانروائی، یا انسانی حکومت کی کوئی دوسری صورت، بہرحال اس کے حق میں قدوسیت کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔

۳۸؎ اصل میں لفظ اَلسَّلَام استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں سلامتی۔ کسی کو سلیم، یا سالم کہنے کے بجائے سلامتی کہنے سے خود بخود مبالغہ کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ مثلاً کسی کو حسین کہنے کے بجائے حُسن کہا جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ وہ سراپا حُسن ہے۔ اللہ تعالیٰ کو اَلسَّلَام کہنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ سراسر سلامتی ہے۔ اس کی ذات اِس سے بالاتر ہے کہ کوئی آفت، یا کمزوری یا خامی اس کو لاحق ہو، یا کبھی اس کے کمال پر زوال آئے۔

۳۹؎ اصل میں لفظ اَلْمُؤْمِن استعمال ہوا ہے جس کا مادہ امن ہے۔ امن کے معنی ہیں خوف سے محفوظ ہونا۔ اور مؤمن وہ ہے جو دوسرے کو امن دے۔ اللہ تعالیٰ کو اس معنی میں مومن کہا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق کو امن دینے والا ہے۔ اس کی خلق اِس خوف سے بالکل محفوظ ہے کہ وہ کبھی اس پر ظلم کرے گا، یا اس کا حق مارے گا، یا اس کا اجر ضائع کرے گا، یا اس کے ساتھ اپنے کیے ہوئے وعدوں کی خلاف ورزی کرے گا۔ پھر چونکہ اس فاعل کا کوئی مفعول بیان نہیں کیا گیا ہے کہ وہ کس کو امن دینے والا ہے، بلکہ مطلقاً المؤمن کہا گیا ہے، اس لیے اس سے یہ مفہوم آپ سے آپ نکلتا ہے کہ اس کا امن ساری کائنات اور اس کی ہر چیز کے لیے ہے۔

۴۰؎ اصل میں لفظ اَلْمُہَیْمِن استعمال ہوا ہے جس کے تین معنی ہیں۔ ایک، نگہبانی اور حفاظت کرنے والا۔ دوسرے، شاہد، جو دیکھ رہا ہو کہ کون کیا کرتا ہے۔ تیسرے، قائم بامور الخلق، یعنی جس نے لوگوں کی ضروریات اور حاجات پوری کرنے کا ذمّہ اٹھا رکھا ہو۔ یہاں بھی چونکہ مطلقاً لفظ المہیمن استعمال کیا گیا ہے، اور اس فاعل کا کوئی مفعول بیان

پاک ہے اللہ اُس شرک سے جو لوگ کر رہے ہیں[۴۴]۔ وہ اللہ ہی ہے جو تخلیق کا منصوبہ بنانے والا اور اس کو نافذ کرنے والا اور اس کے مطابق صورت گری کرنے والا ہے[۴۵]۔ اس کے لیے بہترین نام ہیں[۴۶]۔ ہر چیز جو آسمانوں اور

نہیں کیا گیا کہ وہ کس کا نگہبان و محافظ، کس کا شاہد، اور کس کی خبر گیری کی ذمہ داری اٹھانے والا ہے، اس لیے اس اطلاق نے خود بخود یہ مفہوم نکلتا ہے کہ وہ تمام مخلوقات کی نگہبانی وحفاظت کر رہا ہے، سب کے اعمال کو دیکھ رہا ہے، اور کائنات کی ہر مخلوق کی خبر گیری، اور پرورش، اور ضروریات کی فراہمی کا اس نے ذمہ اٹھا رکھا ہے۔

۴۱ے اصل میں لفظ العزیز استعمال ہوا ہے جس سے مراد ہے ایسی زبردست ہستی جس کے مقابلہ میں کوئی سر نہ اٹھا سکتا ہو، جس کے فیصلوں کی مزاحمت کرنا کسی کے بس میں نہ ہو، جس کے آگے سب بے بس اور بے زور ہوں۔

۴۲ے اصل میں لفظ الجبار استعمال ہوا ہے جس کا مادہ جبر ہے۔ جبر کے معنی ہیں کسی شے کو طاقت سے درست کرنا، کسی چیز کی بزور اصلاح کرنا۔ اگرچہ عربی زبان میں کبھی جبر محض اصلاح کے لیے بھی بولا جاتا ہے، اور کبھی صرف زبردستی کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے، لیکن اس کا حقیقی مفہوم اصلاح کے لیے طاقت کا استعمال ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کو جبار اس معنی میں کہا گیا ہے کہ وہ اپنی کائنات کا نظم بزور درست رکھنے والا اور اپنے ارادے کو، جو سراسر حکمت پر مبنی ہوتا ہے، جبراً نافذ کرنے والا ہے۔ علاوہ بریں لفظ جبار میں عظمت کا مفہوم بھی شامل ہے۔ عربی زبان میں کھجور کے اُس درخت کو جبار کہتے ہیں جو اتنا بلند و بالا ہو کہ اس کے پھل توڑنا کسی کے لیے آسان نہ ہو۔ اسی طرح کوئی کام جو بڑا عظیم الشان ہو عمل جبار کہلاتا ہے۔

۴۳ے اصل میں لفظ المتکبر استعمال ہوا ہے جس کے دو مفہوم ہیں۔ ایک وہ جو فی الحقیقت بڑا نہ ہو مگر خواہ مخواہ بڑا بنے۔ دوسرے وہ جو حقیقت میں بڑا ہو اور بڑا ہی ہو کر رہے۔ انسان ہو یا شیطان، یا کوئی اور مخلوق، چونکہ بڑائی فی الواقع اس کے لیے نہیں ہے، اس لیے اُس کا اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں پر اپنی بڑائی جتانا ایک جھوٹا ادعا اور بدترین عیب ہے۔ اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ حقیقت میں بڑا ہے اور بڑائی فی الواقع اسی کے لیے ہے اور کائنات کی ہر چیز اس کے مقابلے میں حقیر و ذلیل ہے، اس لیے اس کا بڑا ہونا اور بڑا ہی ہو کر رہنا کوئی ادعا اور تصنع نہیں بلکہ ایک امر واقعی ہے، ایک بری صفت نہیں بلکہ ایک خوبی ہے جو اس کے سوا کسی میں نہیں پائی جاتی۔

۳۷؎ یعنی اس کے اقتدار اور اختیارات اور صفات میں، یا اس کی ذات میں۔ جو لوگ بھی کسی مخلوق کو اس کا شریک قرار دے رہے ہیں، وہ درحقیقت ایک بہت بڑا جھوٹ بول رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اس سے پاک ہے کہ کسی معنی میں بھی کوئی اس کا شریک ہو۔

۳۸؎ یعنی پوری دنیا اور دنیا کی ہر چیز تخلیق کے ابتدائی منصوبے سے لے کر اپنی مخصوص صورت میں وجود پذیر ہونے تک بالکل اسی کی ساختہ پرداختہ ہے۔ کوئی چیز بھی نہ خود وجود میں آئی ہے، نہ اتفاقاً پیدا ہو گئی ہے، نہ اس کی ساخت پرداخت میں کسی دوسرے کا ذرہ برابر کوئی دخل ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ کے فعل تخلیق کو تین الگ مراتب میں بیان کیا گیا ہے جو یکے بعد دیگرے واقع ہوتے ہیں۔ پہلا مرتبہ خَلق ہے جس کے معنی تقدیر یا منصوبہ سازی کے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی انجینیئر ایک عمارت بنانے سے پہلے یہ ارادہ کرتا ہے کہ اسے ایسی اور ایسی عمارت فلاں خاص مقصد کے لیے بنانی ہے اور اپنے ذہن میں اس کا نقشہ (DESIGN) سوچتا ہے کہ اس مقصد کے لیے زیر تجویز عمارت کی تفصیلی صورت اور مجموعی شکل یہ ہونی چاہیے۔ دوسرا مرتبہ ہے بَرأ، جس کے اصل معنی ہیں جُدا کرنا، چاک کرنا، پھاڑ کر الگ کرنا۔ خالق کے لیے باری کا لفظ اس معنی میں استعمال کیا گیا ہے کہ وہ اپنے سوچے ہوئے نقشے کو نافذ کرتا اور اُس چیز کو جس کا نقشہ اس نے سوچا ہے، عدم سے نکال کر وجود میں لاتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے انجینیئر نے عمارت کا جو نقشہ ذہن میں بنایا تھا اس کے مطابق وہ ٹھیک ناپ تول کر کے زمین پر خط کشی کرتا ہے، پھر بنیادیں کھودتا ہے، دیواریں اٹھاتا ہے اور تعمیر کے سارے عملی مراحل طے کرتا ہے۔ تیسرا مرتبہ تصویر ہے جس کے معنی ہیں صورت بنانا، اور یہاں اس سے مراد ہے ایک شے کو اس کی آخری مکمل صورت میں بنا دینا۔ ان تینوں مراتب میں اللہ تعالیٰ کے کام اور انسانی کاموں کے درمیان سرے سے کوئی مشابہت نہیں ہے۔ انسان کا کوئی منصوبہ بھی ایسا نہیں ہے جو سابق نمونوں سے ماخوذ نہ ہو، مگر اللہ تعالیٰ کا ہر منصوبہ بے مثال اور اس کی اپنی ایجاد ہے۔ انسان جو کچھ بھی بناتا ہے اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ مادوں کو جوڑ جاڑ کر بناتا ہے۔ وہ کسی چیز کو عدم سے وجود میں نہیں لاتا بلکہ جو کچھ موجود ہے اسے مختلف طریقوں سے ترکیب دیتا ہے۔ بخلاف اس کے اللہ تعالیٰ تمام اشیاء کو عدم سے وجود میں لایا ہے اور وہ مادہ بھی بجائے خود اس کا پیدا کردہ ہے جس سے اس نے یہ دنیا پیدا کی ہے۔ اسی طرح

زمین میں ہے اُس کی تسبیح کر رہی ہے[۴۷]، اور وہ زبردست اور حکیم ہے[۴۸] ع ۳

صورت گری کے معاملہ میں بھی انسان مُوجِد نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی صورتوں کا نقّال اور بھونڈا نقّال ہے۔ اصل مصوّر اللہ تعالیٰ ہے جس نے ہر جنس، ہر نوع، اور ہر فرد کی صورت لاجواب بنائی ہے اور کبھی ایک صورت کی ہوبہو تکرار نہیں کی ہے۔

[۴۶] ناموں سے مراد اسمائے صفات ہیں۔ اور اس کے لیے بہترین نام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے وہ اسمائے صفات موزوں نہیں ہیں جن سے کسی نوعیت کے نقص کا اظہار ہوتا ہو، بلکہ اس کو اُن ناموں سے یاد کرنا چاہیے جو اُس کی صفاتِ کمالیہ کا اظہار کرتے ہوں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ اللہ تعالیٰ کے یہ اسمائے حُسنیٰ بیان کیے گئے ہیں، اور حدیث میں اُس ذات پاک کے ۹۹ نام گنائے گئے ہیں جنھیں ترمذی اور ابن ماجہ نے حضرت ابوہریرہؓ کی روایت سے بالتفصیل نقل کیا ہے۔ قرآن اور حدیث میں اگر آدمی ان اسماء کو بغور پڑھے تو وہ بآسانی سمجھ سکتا ہے کہ دنیا کی کسی دوسری زبان میں اگر اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا ہو تو کون سے الفاظ اس کے لیے موزوں ہوں گے۔

[۴۷] یعنی زبانِ قال یا زبانِ حال سے یہ بیان کر رہی ہے کہ اس کا خالق ہر عیب اور نقص اور کمزوری اور غلطی سے پاک ہے۔

[۴۸] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو تفہیم القرآن، تفسیر سورۂ حدید، حاشیہ ۲۔

اسلامی قانون میں تعزیری جرائم

ڈاکٹر عبدالعزیز عامر

ترجمہ: معروف شاہ شیرازی

جرم کی تعریف فقہاء کی تعریف کے مطابق جُرم "وہ شرعی ممنوع ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے حد یا تعزیر کے ذریعے روکا ہے"۔ اس تعریف سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جس فعل پر تعزیر دی جاتی ہے وہ شارع کی طرف سے ممنوع ہے اور شارع ہی نے اس کو قابلِ سزا جرم قرار دیا ہے۔ نیز اس تعریف سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کوئی ممنوع فعل اس وقت تک جُرم تصور نہ ہوگا جب تک اس کے ارتکاب پر سزا مقرر نہ کی گئی ہو۔ اگر کسی فعل کے ارتکاب پر سزا مقرر نہیں ہے تو وہ فعل جُرم نہیں ہے۔[1]

اب سوال یہ ہے کہ وہ ممنوعات کونسے ہیں جن کا ذکر جرم کی اس تعریف میں کیا گیا ہے۔

جمہور فقہاء کی رائے کے مطابق اصول یہ ہے کہ جس جرم میں حد یا کفارہ مقرر نہ کیا گیا ہو اس میں تعزیری سزا ہوگی۔ اس طرح جس معصیت میں بھی حد یا کفارہ نہ ہو اس میں تعزیری سزا مشروع ہوگی۔ لیکن اس اصول کے باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ بعض معاصی پر تعزیری سزا نہیں ہے اور دوسری طرف بعض افعال ایسے بھی ملتے ہیں کہ وہ معاصی نہیں ہیں مگر اس کے باوجود ان کے ارتکاب پر تعزیری سزا کا حکم لگایا گیا ہے۔ اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہلے معصیت کا مفہوم متعین کریں کیونکہ اسی پر تعزیر کا مدار ہے، اور اس کے بعد اس کی وضاحت بھی کریں کہ بعض اوقات معصیت کے ہوتے ہوئے بھی سزا نہ ہونے اور سزا ہونے کے باوجود معصیت نہ ہونے کا امکان ہوتا ہے

---

[1] فقہاء کی یہ تعریفِ جرم جدید وضعی قوانین کی تعریف سے مطابقت رکھتی ہے۔ جدید قانون کے ماہرین بھی یہی کہتے ہیں کہ صرف وہ فعل یا ترکِ فعل جرم ہوتا ہے جس کے لیے قانون سزا مقرر کرے۔ اگر کسی فعل یا ترکِ فعل کے لیے سزا تجویز نہ کی گئی ہو تو وہ جُرم نہ ہوگا۔ دیکھیے الاحکام العامۃ فی قانون العقوبات مصنفہ ڈاکٹر سعید مصطفیٰ سعید ص ۲۵ طبع ۱۳۰۰ھ مطابق ۱۹۵۲ء

معصیت کی تعریف | فقہاء کا اس بات پر اجماع ہے کہ محرّمات کا ارتکاب اور واجبات کا ترک قابلِ سزا معصیت ہے۔ اگر کوئی شخص کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرے جو اس پر حرام ہو، یا ایسے فعل کو چھوڑ دے جو اس پر واجب ہو، تو وہ معصیت کا مرتکب سمجھا جائے گا اور اگر اس فعل یا ترکِ فعل کے لیے کوئی خاص سزا مقرر نہیں ہے تو وہ شخص تعزیری سزا کا مستوجب ہوگا۔[1]

ترکِ واجب کے معاملہ میں فقہاء جن سلبی افعال کو قابلِ تعزیر قرار دیتے ہیں وہ برسبیلِ مثال یہ ہیں: زکوٰۃ کی ادائیگی نہ کرنا۔ فرض نماز ادا نہ کرنا یہاں تک کہ اس کا وقت نکل جائے۔ امانت میں خیانت، مثلاً امانۃً رکھے ہوئے مال، یا یتیم کا مال، یا اوقاف کی پیداوار، یا وہ اموال جو وکلاء (AGENTS) یا مضاربت کرنے والوں (PARTNERS) کے پاس ہوتے ہیں، ادا نہ کرنا نیز غصب کیا ہوا مال واپس نہ کرنا بھی موجبِ تعزیر ہے۔ صاحب کشاف القناع لکھتے ہیں کہ بائع کی طرف سے مال کے ایسے نقائص کو چھپانا بھی تعزیری جرم ہے جن کا اظہار اس پر واجب ہو، کیونکہ مال کے نقائص کو چھپا کر وہ تدلیس (FRAUD) کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی طرح اجارہ اور نکاح میں دھوکہ بازی، یا کسی معاملے کے فریقین میں سے کوئی تدلیس (FRAUD) کا ارتکاب کرے تو اس پر بھی تعزیری سزا جاری ہوگی۔ گواہ اور مخبر بھی اس ضمن میں آتے ہیں

---

[1] تبصرۃ الحکام۔ ابن فرحون، ج ۲، ص ۲۶۶ - ۲۶۷۔ معین الحکام، ص ۱۹۵۔ کشاف القناع من متن الاقناع ج ۴، ص ۷۵۔ السیاسۃ الشرعیہ، ابن تیمیہ، ص ۵۵۔ الحسبۃ فی الاسلام، ابن تیمیہ ص ۳۸۔ الاحکام السلطانیہ ابو یعلی، ص ۲۴۴ اور اس کے بعد۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی، ص ۲۱۰۔ واجب اور حرام کی تعریف کے لیے دیکھیے علم اصول الفقہ، عبدالوہاب خلاف، ص ۱۱۶ اور اس کے بعد، ص ۱۲۵ اور اس کے بعد، طبع ۲، ۱۳۷۶ھ مطابق ۱۹۵۶ء اس میں ان الفاظ کی تعریف یہ بیان کی گئی ہے کہ "واجب وہ ہے جس میں شارع حتمی طور پر مکلف انسان سے کسی فعل کا مطالبہ کرے اور حرام وہ ہے جس میں شخصِ مکلّف سے یہ حتمی مطالبہ کیا گیا ہو کہ وہ کسی فعل کا ارتکاب نہ کرے"۔ اس سلسلے میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ حنفیہ واجب اور فرض میں فرق کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ فرض وہ ہے جس کا مطالبہ حتمی ہو اور اس کی دلیل قطعی ہو، جس میں کسی قسم کے شبہ کی گنجائش نہ ہو۔ اور واجب وہ ہے جس کا مطالبہ تو حتمی ہو لیکن اس کی دلیل ظنی ہو اور اس میں شبہ کی گنجائش ہو۔ ان کے نزدیک یہی حرام کے مقابلے میں مکروہ تحریمی ہوتا ہے کراہت کا تقابل مکروہ سے ہوتا ہے۔

بشرطیکہ متعلقہ امر کے بارے میں صحیح خبر دینا مخبر پر واجب ہو، مثلاً ایک شخص کو کسی چیز کی نجاست کا علم ہو اور وہ نہ بتائے۔ اگر حکام اور جج اپنے فرض کی ادائیگی میں کوتاہی کریں تو ان پر بھی تعزیری سزا کا نفاذ ہو سکتا ہے۔

ابن رشد کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کو قاضی (JUDGE) مقرر کیا جائے اور وہ اس کو قبول کرنے سے انکار کر دے تو اسے مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں دی جانے والی تعزیری سزا جسمانی ضرب اور قید تک جا پہنچے۔ اس لیے کہ جب اسے جج مقرر کر دیا گیا ہے تو عدل و انصاف کا قیام اس کے ذمے واجب ہو گیا ہے اور اس سے انکار کر کے وہ معصیت کا مرتکب ہو رہا ہے، جس پر اسے تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔[۱]

ممنوعات اور محرمات جن میں تعزیر ہے، اُن کے لیے فقہاء نے جو مثالیں دی ہیں وہ یہ ہیں۔ ایسی چوری جس کی سزا چوری کا نصاب پُورا نہ ہونے یا دوسری شرائط مکمل نہ ہونے کی وجہ سے قطع ید نہ ہو سکتی ہو۔ اجنبی عورت کا بوسہ لینا یا اس کے ساتھ خلوت جس میں زنا کا ثبوت نہ ملے۔ قصداً جھوٹی قسم کھانا۔ بازاروں میں دھوکے کا سودا۔ جھوٹی شہادت۔ مجرمین کو چھپانا اور انہیں پناہ دینا، مثلاً کوئی شخص چوروں اور رہزنوں کو اپنے ہاں چھپا کر رکھے۔ اس طرح کے افعال کا مرتکب ایک ممنوع فعل کا ارتکاب کرتا ہے جو معصیت ہے اور وہ تعزیری سزا کا مستحق بن جاتا ہے۔[۲]

مستحب کے ترک اور مکروہ کے ارتکاب کا حکم یہ بات تو ظاہر ہے کہ واجب کا ترک اور حرام کا ارتکاب ایسی معصیت ہے جس پر ایسی حالت میں تعزیری سزا دی جاتی ہے جبکہ ان جرائم پر از جانب شارع پہلے سے کوئی مقررہ سزا نہ ہو۔ لیکن یہ بات وضاحت طلب ہے کہ ایک مستحب فعل کے ترک یا مکروہ کے ارتکاب پر بھی تعزیری سزا ہے یا نہیں اور یہ کہ آیا یہ فعل معصیت کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟

اصولِ فقہ کے بعض ماہرین کی رائے یہ ہے کہ ہر مستحب فعل دراصل شارع کا مطلوب ہوتا ہے اور شارع

۱۔ ترکِ واجبات کے لیے دیکھیے تبصرۃ الحکام لابن فرحون بر حاشیہ فتح العلی ج ۲ ص ۳۶۶۔ معین الحکام ص ۱۸۹۔ الاحکام السلطانیہ، الماوردی، ص ۲۱۰۔ الاحکام السلطانیہ، ابو یعلیٰ، ص ۲۴۷۔ السیاسۃ الشرعیہ، ابن تیمیہ، ص ۵۵۔ الحسبۃ فی الاسلام، ابن تیمیہ، ص ۳۰۔ کشاف القناع علی متن الاقناع، ج ۴ ص ۷۵۔

۲۔ تبصرۃ الحکام، ابن فرحون، ج ۲، ص ۲۶۷ بر حاشیہ فتح العلی المالک۔

کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ اسی طرح ہر مکروہ فعل ممنوع ہے اور شارع چاہتا ہے کہ اس سے اجتناب کیا جائے۔ مگر واجب اور مستحب میں فرق یہ ہے کہ واجب کا تارک قابلِ مذمت ہوتا ہے اور مستحب کا تارک نہیں ہوتا۔ اسی طرح مکروہ اور حرام میں فرق یہ ہے کہ حرام کا مرتکب قابلِ مذمت ہوتا ہے اور مکروہ کا نہیں ہوتا۔ اس بنا پر یہ حضرات واجب کے تارک اور مکروہ کے مرتکب کو معصیت کا مرتکب نہیں سمجھتے، کیونکہ معصیت ایسے افعال کو کہتے ہیں جن کا ارتکاب قابلِ مذمت ہو، اور ان افعال کو اس رائے کے قائل قابلِ مذمت نہیں سمجھتے۔ البتہ تارکِ مستحبات اور فاعلِ مکروہات کو یہ لوگ خلافِ شرع حرکت کا مرتکب، اور حکمِ شرع کی پابندی نہ کرنے والا قرار دیتے ہیں۔ مخالفِ شرع اور نافرمان ضرور کہتے ہیں۔

علماءِ اصول کا دوسرا گروہ اس رائے کی طرف گیا ہے کہ مستحب مامورات میں داخل نہیں ہے، اسی طرح مکروہ منہیات کے دائرے میں نہیں آتا۔ اس لیے بات صرف اتنی ہے کہ مستحب کا کرنا پسندیدہ اور مکروہ کا ارتکاب ناپسندیدہ ہے۔ ان حضرات کی رائے میں بھی تارکِ مستحب اور فاعلِ مکروہ کسی معصیت کے مرتکب نہ سمجھے جائیں گے، کیونکہ معصیت کا ارتکاب تو صرف اس صورت میں ہوتا ہے کہ جب امر و نہی کی صورت میں شرعی تکلیف (IMPOSITION OF BINDING DUTY) موجود ہو اور یہاں وہ موجود نہیں ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ تارکِ مستحب اور فاعلِ مکروہ کو اگر معصیت کا مرتکب نہیں سمجھا جاتا تو پھر اس فعل پر کیا اسے تعزیری سزا دی جا سکتی ہے؟ اس میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ سزا دی جا سکتی ہے اور بعض کہتے ہیں کہ ایسے شخص کو سزا دینا جائز نہیں ہے۔

جو لوگ سزا دینے کے حق میں نہیں ہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ استحباب اور کراہیت کی حالت میں کوئی صریح حکم موجود نہیں ہوتا، اور جہاں حکم نہ ہو وہاں سزا جائز نہیں۔ اسی اصول کے پیشِ نظر بعض فقہاء نے یہ کہا ہے کہ سزا کا ہونا یا نہ ہونا اس بات کا قرینہ ہوتا ہے کہ فعل مستحب ہے یا واجب، اور مکروہ ہے یا حرام۔ یعنی شارع اگر کسی فعل پر سزا دیتا ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ فعل واجب یا حرام ہے اور اگر سزا نہیں دی جاتی تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ فعل مستحب یا مکروہ ہے۔[1]

---

[1] واضح رہے کہ اسلامی قانون میں فعل اور ترکِ فعل (DOING AND ABSTENTION FROM DOING) دونوں کے لیے فعل کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ (مترجم)

جو لوگ مکروہ فعل کے ارتکاب اور مستحب فعل نہ کرنے کی صورت میں سزا کے قائل ہیں ان کا استدلال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس واقعہ سے ہے کہ ایک شخص نے بکری کو ذبح کرنے کے لیے باندھ کر لٹا دیا اور اسے اسی حالت میں چھوڑ کر چھری تیز کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اسے تعزیری سزا دی۔ چونکہ یہ فعل مکروہ تھا اور اس کے مرتکب کو سزا دی گئی لہٰذا یہ لوگ کہتے ہیں کہ ترک مستحب اور ارتکاب مکروہ پر سزا دی جاسکتی ہے[1]

میری رائے بھی یہ ہے کہ ترکِ مستحب اور فعل مکروہ پر تعزیری سزا دی جاسکتی ہے کیونکہ بسا اوقات مستحب فعل کرنے اور مکروہ فعل کے نہ کرنے میں پورے معاشرے کی مصلحت ہوتی ہے اور شریعت کا اوّلین مقصد ہی یہ ہے کہ پورے معاشرے کو برائیوں اور آلودگیوں سے پاک کیا جائے، لوگوں سے ایسے کام کروائے جائیں جن میں ان کی بھلائی ہو اور ایسے کاموں سے ان کو روکا جائے جو ان کے لیے مضر ہوں۔ ان مقاصد کا تقاضا ہے کہ جن معاملات کی نوعیت یہ ہو ان میں ترکِ مستحب اور ارتکابِ مکروہ پر حکومت تعزیری سزا کے نفاذ کی مجاز ہو۔ اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جو لوگ مستحب اور مکروہ کو امر و نہی کے دائرے سے خارج سمجھتے ہیں وہ بھی تارکِ مستحب کو قابل عتاب اور فاعلِ مکروہ کو لائق ملامت سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک یہ عتاب و ملامت دنیا میں بھی ہے اور آخرت میں بھی۔ اب یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں عتاب و ملامت کو ایک خفیف قسم کی تعزیر ہی کہا جاسکتا ہے۔ اس طرح ان حضرات کے نزدیک بھی ان افعال پر کسی قدر تعزیری سزا جائز ہو جاتی ہے۔ اگر یہ رائے درست ہے تو پھر ترک مستحب اور فعل مکروہ کے قابلِ سزا ہونے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ ایسے افعال ہیں جو معصیت

---

[1] المستصفیٰ، الغزالی، ج ۱، ص ۷۵-۷۶، طبع اوّل، مطبع امیریہ، بولاق مصر ۱۳۲۲ھ۔ الاحکام فی اصول الاحکام، آمدی، ج ۱، ص ۱۶۰ اور اس کے بعد، طبع ۱۳۳۲ھ، مطابق ۱۹۱۴ء مطبع المعارف مصر (اس میں لکھا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ مکروہ اور مستحب تکلیفی احکام (BINDING ORDERS) ہی کے ضمن میں آتے ہیں)۔ مواہب الجلیل ج ۶، ص ۳۲۰، طبع اول ۱۳۲۹ھ، مطبع السعادۃ القاہرہ ــــ علم اصول الفقہ، استاد شیخ عبدالوہاب خلاف ص ۱۲۳ اور اس کے بعد۔ انہوں نے مستحب کی تعریف یوں کی ہے "مستحب وہ ہوتا ہے جس کے کرنے کا شارع کی طرف سے حکم تو ہو لیکن حکم حتمی نہ ہو، اور مکروہ وہ ہوتا ہے جس کے ارتکاب سے رکنے کا تو مطالبہ کیا گیا ہو لیکن حکم حتمی نہ ہو"۔ التشریع الجنائی الاسلامی ص ۱۲۹-۱۳۰، ص ۱۵۵-۱۵۶۔

نہ ہونے کے باوجود ممنوع ہیں - اور یہ بات ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ ممنوعات وہ جرائم ہیں جن کو شارع نے قابلِ سزا قرار دیا ہے، لہٰذا فعلِ مکروہ اور ترکِ مستحب پر اگر سزا ہو تو وہ جرائم میں شمار ہوں گے۔

معصیت کے بغیر تعزیر | بعض فقہا کہتے ہیں کہ اگر فعل معصیت کے دائرے میں نہ بھی آتا ہو تو بھی مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔ مثلاً ایک غیر مکلّف شخص کسی ایسے فعل کا ارتکاب کرتا ہے جس پر ایک مکلّف شخص کو تعزیری سزا دی جا سکتی ہے۔ ایک ایسے شخص کو بھی سزا دی جا سکتی ہے جو مباح نوعیت کے لہو و لعب کو ذریعۂ معاش بناتا ہے۔ ایسے شخص ہی کو نہیں بلکہ اسے اجرت دینے والے کو بھی تعزیری سزا دی جا سکتی ہے جبکہ مصلحتِ عامہ اس کی متقاضی ہو۔ مصلحتِ عامہ کے لیے مُخنّث کو ملک بدر کیا جا سکتا ہے تاکہ لوگ اسے عورتوں کی سی حرکتیں کرتے نہ دیکھیں اور دوسرے لوگ اس کی تقلید میں مخنّث نہ بنیں۔[۱]

مصلحتِ عامہ کی خاطر غیر معصیت افعال پر تعزیری سزا دینے کے جواز میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس فعل سے بھی استدلال کیا گیا ہے کہ آپ نے ایک شخص کو چوری کے الزام میں حوالات بھیج دیا اور جب تحقیق کے بعد معلوم ہوا کہ وہ شخص بے گناہ ہے تو اسے رہا کر دیا گیا۔ حضورؐ نے محض الزامِ جرم کی بنا پر اُسے قید کر دیا تھا درآنحالیکہ اس سے کسی ایسی معصیت کا ارتکاب نہ ہوا تھا جو موجبِ تعزیر ہو۔[۲]

میں سمجھتا ہوں جو شخص عورتوں سے تشبّہ کرتا ہے اسے جو سزا دی جاتی ہے وہ معصیت پر سزا ہے کیونکہ عورتوں سے تشبّہ جائز نہیں ہے، اور جو یہ کام کرے گا وہ دراصل معصیت کا مرتکب ہوگا۔ رہی یہ بات کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے چوری کے ملزم کو صرف مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر قید میں رکھا، تو میرے خیال میں یہ تفتیش کے لیے ایک انتظامی کارروائی تھی اور ملزم کو احتیاطاً اس وقت تک قید میں رکھا گیا جب تک یہ معلوم نہ ہو گیا کہ وہ مجرم نہیں ہے۔ یہ احتیاط مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر ضروری تھی۔ ہم اسے تعزیری سزا نہیں کہہ سکتے۔ معصیت کا لفظ عصیان سے ہے، اس لیے اس میں خود متعلقہ شخص کے حال کو ضرور پیشِ نظر رکھا جائیگا

---

[۱] نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج ۷، ص ۱۷۳، ۱۷۴ - حاشیۂ ابی الضیاء الشیخ علی الشبراملسی علی شرح المنہاج - یہ نہایۃ المحتاج کے حاشیہ پر چھپا ہوا ہے، ص ۱۷۳، ۱۷۴ -

[۲] شرح فتح القدیر، ج ۴، ص ۱۱۷ -

کہ وہ فی الواقع عاصی ہو۔ اگر وہ مکلف ہی نہیں ہے تو اس کا عاصی ہونا ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا ایک نابالغ کا فعل جو غیر مکلف ہے، معصیت نہیں ہوسکتا اور اسے جو تعزیری سزا دی جائے گی وہ بغرض اصلاح و تربیت ہوگی، یہ مصلحتِ عامہ کا تقاضا ہے۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ لہو مباح کا عامل مرتکب معصیت نہیں ہے، کیونکہ جس فعل کا وہ ارتکاب کر رہا ہے وہ مباح ہے اور کسی فعل کو معصیت نہیں کہا جاسکتا جب تک کہ اس کے خلاف شریعت نے کوئی حکم نہ دیا ہو۔ لہٰذا لہو مباح کو کمائی کا ذریعہ بنانے والے پر تعزیر صرف مصلحتِ عامہ کے تقاضے سے ہوسکتی ہے۔[۱]

اس بحث کے نتیجے میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر تعزیری سزا بعض ان افعال پر بھی دی جاسکتی ہے جن میں معصیت کا ارتکاب نہ کیا گیا ہو۔ لہٰذا ان اصولوں کے پیشِ نظر ہر اس شخص کو تعزیری سزا دی جاسکتی ہے جو معاشرے کے لیے خطرہ بن رہا ہو، اگرچہ اس نے بالفعل معصیت کا ارتکاب نہ کیا ہو۔ مثلاً اس شخص کو قید کیا جاسکتا ہے جس کے متعلق یہ بات معروف ہو کہ وہ لوگوں کی جان، مال اور آبرو پر دست درازی کرتا ہے، اگرچہ اس کے خلاف کوئی جرم ثابت نہ ہو۔

معصیت کے باوجود تعزیر کا سقوط جیسا کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے، شریعت میں قاعدہ تو یہ ہے کہ تمام ان معصیتوں پر تعزیر ہے جن میں سزا مقرر نہیں کی گئی ہے، اور ان ممنوعات تک پر تعزیر ہے جو معصیت بھی نہیں ہیں۔ لیکن ان قواعد کے باوجود بعض فقہاء نے اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ بعض حالات میں معصیت ہونے ہوئے بھی تعزیری سزا نہ دی جائے گی۔

اس کی مثال یہ دی گئی ہے کہ مثلاً کوئی شخص خود اپنے اعضاء کاٹ لیتا ہے، یا اپنے جسم کو ضربات پہنچاتا ہے، زخمی کرتا ہے، یا خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ یہ شخص شرعاً معصیت کا ارتکاب کر رہا ہے، کیونکہ یہ سب افعال حرام ہیں۔ لیکن اگر ان حالات میں کوئی تعزیری سزا کے نفاذ کا قائل نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ کوئی حالت ایسی بھی ہے جس میں معصیت تو ہوتی ہے مگر سزا نہیں ہوتی۔[۲]

---

[۱] مصلحتِ عامہ کے پیشِ نظر تعزیری سزا کی بحث کے لیے دیکھیے التشریع الجنائی الاسلامی ص ۱۴۹ اور اس کے بعد۔

[۲] نہایۃ المحتاج الی شرح المنہاج، ج، ص ۱۷۲ اور اس کے بعد۔ حاشیۃ ابوضیا الشیخ الشبراملسی علی شرح المنہاج بر حاشیہ کتاب مذکور، ص ۱۷۲ اور اس کے بعد۔

مَیں سمجھتا ہوں کہ بے شک اس مثال میں قصاص تو ممکن نہیں ہے، اور تعزیری سزا کو اس لیے روکا گیا ہے کہ اس شخص کو پہلے ہی اپنے ہاتھوں جسمانی اذیت پہنچ چکی ہے لہٰذا مزید سزا کی ضرورت نہیں ہے۔ لیکن اس کے باوجود میرے نزدیک اس صورت میں کوئی چیز تعزیری سزا سے مانع بھی نہیں ہے۔ اس لیے کہ وہ شخص اگرچہ اپنے نفس ہی پر زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے، مگر اپنے نفس کی حفاظت بھی شرعاً واجب ہے۔

"جرم" معصیت کا مرادف نہیں ہے | اس پوری بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ جرم کا دائرہ معصیت سے وسیع تر ہے۔ معصیت بھی جرم میں داخل ہے اور اس کے ساتھ دوسرے ممنوع افعال بھی جرم ہیں مثلاً ترک مستحب اور فعل مکروہ، نیز وہ افعال بھی اس میں داخل ہیں جو معصیت کی تعریف میں بھی نہیں آتے، نہ ترک مستحب اور فعلِ مکروہ کی تعریف میں آتے ہیں بلکہ بر بنائے مصلحت ان کا ارتکاب ممنوع ہوتا ہے اور ان پر تعزیری سزا دی جاتی ہے۔ اس لیے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ جرم اور معصیت ہم معنی ہیں۔

جن ممنوعات پر تعزیری سزا واجب ہے ان کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کے ہم جنس جرائم کے لیے مقررہ سزائیں ہوں لیکن وہ سزائیں ان پہ اس لیے نافذ نہ ہو سکتی ہوں کہ نفاذِ سزا کی لازمی شرائط پوری نہ ہو رہی ہوں۔ دوسرے وہ جن کے لیے سزا تو مقرر ہو لیکن شبہ کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے اس کا نفاذ نہ ہو سکتا ہو۔ تیسرے وہ جن کے لیے سرے سے شریعت نے کوئی خاص سزا مقرر نہ کی ہو۔ ان جرائم سے ہم تفصیل بحث کریں گے اور ہماری بحث میں جرائم کی تقسیم اس محل کے مطابق ہو گی جس پہ جرم کا وقوع ہو رہا ہو۔

اسلامی تاریخ میں علماء اور حکّام کا کردار

شیخ عبدالعزیز بدری، عراق

ترجمہ: خلیل حامدی صاحب

فریضۂ امر بالمعروف اللہ تعالیٰ نے اسلام کو انسانی زندگی کا مکمل نظام قرار دیا ہے اور اسلامی عقیدہ کو قیامت تک کے لیے انسانیت کے لیے فلاح وسعادت کا موجب ٹھیرایا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اسلام میں سیاسی طاقت کو خاص اہمیت دی ہے اور اس کا اصل مدعا اسلامی نظام کا عملی نفاذ، دنیا میں عقیدۂ اسلامی کی اشاعت اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں انسانوں کے معاملاتِ زندگی کی نگرانی ہے۔ یہ سیاسی اقتدار امت کے ہر ہر فرد کو سونپا گیا ہے، لیکن چونکہ مجموعی طور پر امت کا ہر ہر فرد اس اقتدار کو ہاتھ میں نہیں لے سکتا اس لیے امت اپنے اندر سے ایک ایسے شخص کو منتخب کرے گی جو نیابۃً اس اقتدار کو قائم کرے گا۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے امت کے ہر ہر فرد کا یہ حق باقی رکھا ہے کہ وہ صاحبِ اقتدار کا محاسبہ کرے، اور اگر وہ امت کے معاملات کی دیکھ بھال میں کوتاہی برت رہا ہو یا احکامِ اسلام کے نفاذ سے منحرف ہو گیا ہو، یا اُس نے اسلام کی اشاعت کو ترک کر رکھا ہو تو اس کی پوری پُوری بازپرس کرے۔ اسلام نے صاحب اقتدار شخص کے محاسبہ کو محض امت کا ایک حق ہی نہیں قرار دیا کہ اس حق کے ترک واختیار میں اُسے آزادی ہو بلکہ اسے عام مسلمانوں کے لیے فرض اور علماء کے لیے فرض عین قرار دیا۔ اس لیے کہ علماء ہی امت کے حقیقی پیشوا اور امت کا باشعور گروہ شمار ہوتے ہیں، دین کے نگہبان اور احکامِ دین کے مبلغ اور داعی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلْتَكُنْ مِّنكُمْ أُمَّةٌ يَدْعُونَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (آل عمران: ۱۰۴)

تم میں سے ایک گروہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جو بھلائی کی دعوت دے اور نیکی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔

اور جیسا کہ امام محمد الباقر رضی اللہ عنہ نے اپنے جدِ امجد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہوئے بیان کیا ہے: انکارِ منکر سے مراد محاسبہ ہے، اور امر بالمعروف سے مراد وہ نصیحت ہے جو بھلائی کی دعوت پر مبنی ہو، اور بھلائی نام ہے قرآن کریم کے اتباع اور سنّت مطہرہ کی پیروی کا۔[1]

جو شخص اسلام کے اِس مقصد کو قائم نہیں کرتا اور اس فرض کو ادا کرنے میں کوتاہی برتتا ہے، اسلام اُسے مستوجبِ سزا ٹھیراتا ہے۔ اُس کے بارے میں متعدد تہدیدیں اور وعیدیں بیان کی گئی ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

من رآی سلطانا جائراً مستحلاً لحرام اللہ ناکثاً لعھد اللہ مخالفاً لسنۃ رسول اللہ مایعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیّر بقول ولا فعل کان حقاً علی اللہ ان ید خلہ مدخلہ[2]

جو شخص کسی صاحبِ اقتدار کو اس حال میں دیکھتا ہے کہ وہ ظلم و ستم کر رہا ہے، اللہ کی حرمتوں کو حلال ٹھیرا رہا ہے، اللہ کے عہد توڑ رہا ہے، رسولِ خدا کی سنت کی خلاف ورزی کر رہا ہے، خلقِ خدا کے ساتھ گناہ اور زیادتی کا سلوک کر رہا ہے، اور پھر وہ اُسے زبان یا عمل سے بدلنے کی کوشش نہیں کرتا تو اللہ کے لیے یہ حق ہے کہ وہ اُسے بھی وہیں داخل کرے جہاں اس (صاحبِ اقتدار) کو داخل کرے گا۔

ظاہر ہے کہ ظالم حکمران کا انجام دوزخ ہے، اور قیامت کے روز وہ اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کا نشانہ ہوگا۔ پس اس ارشادِ نبوی کی رُو سے ویسا ہی انجام اُس شخص کا بھی ہوگا جس نے ظالم حکمران کا محاسبہ نہ کیا اور اُسے غلط کاموں پر نہ ٹوکا۔ رسولِ خدا علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کا ایک اور ارشاد ہے:

والذی نفسی بیدہٖ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر ولتأخذن علی ید الظالم

اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے تم پر لازم ہے کہ نیکی کا حکم دو اور بدی سے روکو اور

[1] امام موصوفؒ کا یہ قول ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔

[2] طبری نے اس ارشاد کو تاریخ میں اور ابن اثیر نے کامل میں نقل کیا ہے۔

ولتأطرنه علی الحق أطرا ولتقصرنه علی الحق قصرًا اولیضربن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض ولیلعننکم کما لعن بنی اسرائیل۔ (ابوداؤد۔ ترمذی)

ظالم کا ہاتھ پکڑ لو اور اُسے حق کی طرف موڑ دو، اور اس کو حق پر ٹھہرنے کے لیے مجبور کرو ورنہ اللہ تمہارے لوں کی بُرائیاں ایک دوسرے پر مسلط کر دے گا یا تم پر اُسی طرح لعنت کرے گا جس طرح بنی اسرائیل پر کی۔

جو لوگ حکام کا محاسبہ و تنقید کرتے ہیں اور بروقت اُن کے بُرے کاموں پر انہیں نکیر کرتے ہیں ان لوگوں کی عاقبت کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت دی ہے کہ وہ شہداء کے زمرے میں شامل ہوں گے، بلکہ شہداء کے سردار ہوں گے۔ آنجناب صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان مبارک ہے:

سیّد الشہداء حمزہ بن عبد المطلب و رجل قام الی امام ظالم فامرہ ونہاہ فقتلہ (حاکم نے اسے بسند صحیح روایت کیا ہے)

شہداء کے سردار حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص ہے جو ظالم حکمران کے سامنے کھڑا ہوا اور اُسے نیکی کی تلقین کی اور بُرائی سے منع کیا اور اُس حاکم نے اُسے قتل کر دیا۔

انہی لوگوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ یہ اللہ کے عذاب اور اُس کی سزا کی سختیوں سے نجات پانے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

فَلَمَّا نَسُوا مَا ذُكِّرُوا بِهِ أَنجَيْنَا الَّذِينَ يَنْهَوْنَ عَنِ السُّوءِ وَأَخَذْنَا الَّذِينَ ظَلَمُوا بِعَذَابٍ بَئِيسٍ بِمَا كَانُوا يَفْسُقُونَ۔ (اعراف: ۱۶۵)

اور جب وہ اُن ہدایات کو فراموش کر گئے جو انہیں یاد کرائی گئی تھیں تو ہم نے اُن لوگوں کو بچا لیا جو بُرائی سے روکتے تھے اور باقی سب لوگوں کو جو ظالم تھے ان کی نافرمانیوں پر سخت عذاب میں پکڑ لیا۔

امتِ مسلمہ کو بہترین امت ہونے کا جو منصب دیا گیا ہے وہ منصب اسی فرض کے قیام کے ساتھ مشروط ہے۔ جب تک یہ امت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کاربند رہے گی اُسے خیر امت ہونے کا شرف حاصل رہے گا، ورنہ اُس سے یہ شرف چھن جائے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ۔

تم وہ بہترین امت ہو جسے انسانوں کے لیے پیدا کیا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور

وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ ۔ (آل عمران - ۱۱۰) اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

نیک حکمران ہمیشہ تنقید برداشت کرتے رہے ہیں امتِ مسلمہ کے اسلاف میں جو نیک نہاد اور صالح حکمران تھے وہ امت کے حقِ محاسبہ و تنقید کا پورا پورا احترام ملحوظ رکھتے تھے اور اُسے عملاً تسلیم کرتے تھے۔ اور انہیں اس امر کا بھی پورا احساس تھا کہ انکارِ منکر کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر مسلمان کا فرض ٹھیرایا گیا ہے، چنانچہ انہوں نے ہمیشہ ہر شخص کو تنقید و محاسبہ اور انکارِ منکر کا حق دیا اور غیر مشروط طور پر اس فرض کو بروئے کار لانے کی اجازت دی۔ بلکہ ہمیں ایسے پاکیزہ نفس اور وسیع الظرف حکمران بھی اسلامی تاریخ میں ملتے ہیں جنہوں نے ازخود امت سے یہ مطالبہ کیا کہ اُن کے اعمال پر کڑی نظر رکھی جائے اور اگر اُن سے کوئی غلطی سرزد ہو تو اُس کی اصلاح کی جائے اور جب تک وہ حکومت اور اقتدار کو اخلاص کے ساتھ استعمال کرتے ہیں اور اس سے ذاتی اغراض کے بجائے محض اللہ کی خوشنودی کے طلبگار رہیں، محاسبہ اور اصلاح کا سلسلہ جاری رکھا جائے۔

تنقید کے بارے میں اسلام کے خلیفۂ اوّل کا رویہ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں جو رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفۂ اوّل ہیں۔ آپ نے جب حکومت کی زمام ہاتھ میں لی تو مسلمانوں سے فرمایا:

فان احسنت فاعینونی وان اساءت فقوموني، اطیعوني ما اطعت الله ورسوله فیکم (اگر میں درست کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر غلط روش اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو، اور میری اطاعت کرو جب تک میں تمہارے درمیان اللہ اور اس کے رسول کی پیروی کرتا رہوں۔

خلیفۂ دوم کی مثال دوسری مثال امیرالمومنین عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی پیش کی جا سکتی ہے۔ امیرالمومنین نے واشگاف الفاظ میں فرمایا تھا: من رأى منكم فيّ اعوجاجا فليقومه (تم میں سے جس شخص کو میرے اندر کوئی کجی نظر آئے تو اُسے چاہیے کہ وہ اُسے سیدھا کر دے)۔ کجی کو سیدھا کرنے سے مراد محاسبہ اور تنقید ہی ہے جس حکمران کے ہاتھ میں مسلمانوں کے معاملات کی زمام کار ہے اسلام اُس پر یہ لازم ٹھیراتا ہے کہ وہ کشادہ دلی اور فراخ حوصلگی کے ساتھ محاسبہ اور تنقید کی آواز کو سُنے، اور اگر یہ محاسبہ اسلام کے احکام کے مطابق ہو تو اُسے قبول کرے۔ اس کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ کسی شخص کو اس بنا پر سزا دے کہ اُس نے اُس پر تنقید کی ہے، خواہ یہ تنقید کتنی ہی تند و تیز کیوں نہ ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ مطالبہ کیا کہ اُن کے اندر کوئی کجی ہو

تو اُسے سیدھا کر دیا جائے تو اُس کے جواب میں ایک اعرابی نے اٹھ کر جو کچھ کہا تھا وہ بھی سننے کے قابل ہے۔ اعرابی نے کہا: واللہ یا عمر، لو رأینا فیک اعوجاجا لقوّمناہ بحد سیوفنا (بخدا اے عمرؓ اگر ہم نے تمہارے اندر کوئی کجی دیکھی تو اُسے اپنی تلواروں کی دھار سے سیدھا کر دیں گے)۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس اعرابی کے جواب کو نہ صرف درست سمجھا بلکہ اس پر مسرّت کا اظہار کیا اور فرمایا: الحمد للہ جعل فی امۃ محمد من یقوّم عمر بسیفہ (شکر ہے اُس خدا کا جس نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کے اندر ایسے لوگ مہیا فرما دیئے ہیں جو عمرؓ کو اپنی تلوار سے سیدھا کریں گے)۔ سیّدنا عمرؓ اس بات پر خوش تھے کہ ان کی کجی کو درست کر دیا جائے اور بزورِ شمشیر — ہاں بزورِ شمشیر! — ان کی غلطیوں کی تصیح کی جائے۔ مگر موجودہ دور کے حکمرانوں اور ان کے ملازموں کو دیکھیں تو وہ بزورِ شمشیر تو کجا یہ تک برداشت نہیں کرتے کہ محض زبان یا قلم سے اُن کی غلطی اُن پہ واضح کر دی جائے۔ ایک مرتبہ ایک شخص نے کہا تھا: "اِتَّقِ اللّٰہَ یا عمر" (اے عمر خدا سے ڈر)۔ اس پر حاضرین میں سے ایک شخص نے اُسے ٹوکا، اور کہا کہ امیر المومنین کے حق میں ایسے الفاظ کہتے ہو؟ مگر سیدنا عمرؓ نے ٹوکنے والے شخص کو ڈانٹا اور اپنا وہ مشہور قول بیان کیا جو ہر صالح حکمران کے لیے ایک مثال قرار پا چکا ہے۔ انہوں نے فرمایا: لا خیر فیکم ان لم تقولوھا و لا خیر فینا ان لم نسمعھا (اگر تم لوگ ایسی بات نہ کہو تو تمہارے اندر کوئی بھلائی نہیں۔ اور اگر ہم ایسی بات نہ سنیں تو ہمارے اندر کوئی بھلائی نہیں۔

اس معاملے میں حضرت علیؓ کی ہدایات امیر المومنین علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنے تمام والیوں اور عمّال کو یہ تلقین کر دی تھی کہ جب تک محاسبہ اور تنقید میں اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری کی روح کارفرما ہو اُس وقت تک وہ ہر محاسبہ کرنے والے کا محاسبہ قبول کرتے رہیں۔ امیر المومنین فرماتے ہیں: فطوبیٰ لذی قلب سلیم اطاع من یھدیہ و تجنب من یردیہ و اصاب سلامۃ ببصر من بصّرہ و طاعۃ ھادٍ امرہ[1]۔ (خوشی ہو اُس پاکیزہ دل انسان کے لیے جس نے اُس شخص کی فرمانبرداری کی جو اُسے سیدھی راہ بتاتا ہے اور اُس شخص سے اجتناب کیا جو اُسے تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ اُس نے حقیقت سے آگاہ کر دینے والے شخص

---

[1] نہج البلاغہ ج ۳ ص ۲۲۲

کی بینائی اور راہ یاب شخص کی اطاعت کی بدولت سلامتی کا راستہ پا لیا)۔

امیر معاویہؓ کا تحمل | ایک شخص نے امیر المومنین معاویہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ درشت کلامی کی۔ آپؓ سے کہا گیا کہ ایسی درشت کلامی پر بھی آپ بُردباری برتتے ہیں۔ آپؓ نے فرمایا: "جب تک یہ لوگ ہمارے اور اقتدار کے درمیان حائل نہیں ہوتے میں اُن کے اور اُن کی زبانوں کے درمیان حائل نہیں ہوں گا۔"[1]

علمائے اُمت کی حق گوئی | یہ تو تھا حکمرانوں کا نمونہ۔ اب ہم ذیل میں اسلامی عہد کے علماء کی سیرت کے چند واقعات پیش کرتے ہیں جو محاسبۂ حکام کی منہ بولتی تصویریں ہیں اور جن سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اُمت نے اس اہم فرض کو کس طرح قائم کیا:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں ایک مرتبہ مسلمانوں کو غنیمت میں یمن کی چادریں ملیں امیر المومنین عمر رضی اللہ عنہ نے انتہائی عدل و انصاف کے ساتھ ان چادروں کو تقسیم کر دیا۔ عام مسلمانوں کی طرح اُن کے حصہ میں بھی ایک چادر آئی اور ان کے لڑکے عبداللہ کو بھی ایک چادر ملی۔ حضرت عمرؓ کو ایک کُرتہ کی ضرورت تھی۔ چونکہ آپ دراز قامت تھے، اس لیے آپؓ کے لڑکے عبداللہؓ نے اپنے حصہ کی چادر بھی آپ کو دے دی تاکہ آپ اپنے قد کے مطابق کُرتہ سلوا سکیں۔ آپ نیا کرتہ پہنے خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے پہلے آپ نے اللہ کی حمد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ثنا بیان فرمائی اور پھر کہا: "لوگو! سنو اور اطاعت کرو۔" آپؓ نے ابھی اتنا ہی فرمایا تھا کہ ایک جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کھڑے ہو گئے اور بولے "ہمارے اوپر آپ کی بات سننا اور اطاعت کرنا واجب نہیں رہا۔" آپ نے پوچھا: "کیوں؟" سلمانؓ فارسی نے جواب دیا: "آپ کو یہ کُرتہ کہاں سے مل گیا ہے، حالانکہ آپ کو صرف ایک چادر ملی ہے اور آپ دراز قد ہیں ایک چادر سے آپ کا کُرتہ تیار نہیں ہو سکتا۔" حضرت عمرؓ نے فرمایا: "جلد بازی سے کام نہ لو۔" پھر آپ نے عبداللہ کو پکارا۔ مگر کوئی جواب نہ ملا۔ آپ نے آواز دی: "اے عمرؓ کے بیٹے عبداللہ"۔ عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "لبیک یا امیر المومنین!" آپ نے فرمایا: "میں تجھے خدا کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ جو چادر میں نے پہن رکھی ہے کیا یہ تیری چادر ہے؟" عبداللہ بن عمرؓ نے کہا: "خدا شاہد ہے کہ یہ میری چادر ہے۔" حضرت سلمان فارسیؓ نے جب عبداللہ بن عمرؓ کا یہ

[1] یہ واقعہ سراج الملوک کے مصنف نے نقل کیا ہے۔

جواب سُنا تو کہا: اے امیرالمومنین آپ حکم دیں، ہم سُنیں گے اور پُوری پُوری اطاعت کریں گے۔[۱]

ایک روز امیرالمومنین معاویہ رضی اللہ عنہ منبر پر جلوہ افروز ہوئے۔ انہوں نے مسلمانوں کے عطایا بند کر دیئے تھے۔ چنانچہ منبر پر چڑھ کر جب انہوں نے یہ فرمایا کہ "لوگو! سنو اور اطاعت کرو" ابومسلم خولانی کھڑے ہو گئے اور امیرالمومنین کے تصرف بے جا پر گرفت کی، اور کہا: اے معاویہ! ہم آپ کی بات نہ سنیں گے اور نہ آپ کی اطاعت کریں گے" حضرت معاویہؓ نے دریافت کیا: کیوں اے ابومسلم! ابومسلم نے جواب دیا: معاویہؓ تم عطایا کو کیسے بند کر سکتے ہو۔ یہ تمہاری یا تمہارے ماں باپ کی کمائی سے جاری نہیں کیے گئے۔ حضرت معاویہؓ یہ کلام سُن کر غضب ناک ہو گئے۔ منبر سے اُتر آئے اور حاضرین سے کہا کہ تم سب لوگ اپنی اپنی جگہ بیٹھے رہو کچھ دیر تک لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہو گئے اور پھر نہا کر دوبارہ آئے، اور فرمایا: ابومسلم نے مجھ سے ایسی بات کہی ہے جس کی وجہ سے مجھے طیش آگیا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا ہے کہ غصہ شیطان کی اکساہٹ سے پیدا ہوتا ہے اور شیطان کی تخلیق آگ سے کی گئی ہے۔ اور آگ کو پانی سے بجھایا جا سکتا ہے۔ پس جب کسی شخص کو غصہ آئے تو وہ نہالے۔" چنانچہ میں نے گھر جا کر غسل کیا ہے۔ ابومسلم نے صحیح کہا ہے کہ یہ عطایا میری یا میرے باپ کی کمائی میں سے نہیں ہیں۔ پس لوگو اپنے اپنے عطایا وصول کر لو۔[۲]"

اور اگر یہ خیال کیا جائے کہ اس قصہ میں ایک طرف حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ ہیں جو اپنے حلم میں نامور تھے اور دوسرے ابومسلم خولانی ہیں۔ اور یہ وہ دَور تھا کہ اُمّتِ مُسلمہ کے حکام اور رعایا دونوں خیر پر قائم تھے۔ تو ہم اس سے اگلے دَور کی مثال پیش کرتے ہیں:

امام سفیان ثوریؒ بیان کرتے ہیں جب خلیفہ المہدی حج کو گیا تو اُس نے کہا کہ سفیان کو میرے سامنے حاضر کیا جائے۔ چنانچہ مہدی کے آدمیوں نے میرے گھر کا محاصرہ کر لیا اور مجھے رات کے وقت گرفتار کر کے لے گئے۔ جب میں مہدی کے سامنے حاضر ہوا تو مہدی نے مجھے اپنے قریب بٹھا لیا اور مجھ سے کہا تم ہمارے

---

[۱] العدالۃ الاجتماعیہ از سید قطب

[۲] اس قصہ کو ابونعیم اصفہانی نے حلیۃ الاولیاء میں روایت کیا ہے۔ امام غزالیؒ نے اسے احیاء العلوم ج ۵ ص میں نقل کیا ہے۔

پاس کیوں نہیں آتے تاکہ ہم اپنے معاملات میں تم سے مشورہ کیا کریں۔ جس بات کا تم حکم کروگے ہم اُسے اختیار کریں گے اور جس سے روکو گے اُس سے باز رہیں گے "؟ میں نے پوچھا "اس سفر میں تم نے کتنا خرچ کیا ہے"؟ مہدی نے کہا: "مجھے کچھ معلوم نہیں ہے، میرے خزانچی اور سکرٹری ہی یہ بتا سکتے ہیں"۔ میں نے کہا: "کل قیامت کے روز جب تو اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوگا اور ان مصارف کے بارے میں تجھ سے سوال ہوگا تو تو کیا عذر پیش کرے گا؟ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب حج کیا تھا تو انہوں نے اپنے غلام سے پوچھا کہ اس سفر میں کتنا خرچ ہو چکا ہے؟ اُس نے بتایا کہ اٹھارہ دینار خرچ ہو چکے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے سُن کر کہا: ستیاناس ہو ہم نے مسلمانوں کے بیت المال پر بہت بار ڈال دیا ہے۔ اور کیا تیرے علم میں وہ روایت بھی ہے جو منصور بن عمار نے ہم سے بیان کی ہے؟ بلکہ تو خود اس مجلس میں موجود تھا اور اس روایت کو قلمبند کرنے والا تھا۔ منصور نے ابراہیم اور اسود کے واسطے سے حضرت علقمہ کی یہ روایت بیان کی کہ حضرت عبداللہ بن مسعود بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: رب متخوص فی مال اللہ ومال رسول اللہ فیما شاءت نفسه له النار غداً (اللہ کے مال اور اللہ کے رسول کے مال کو خواہشاتِ نفس کے مطابق صرف کرنے والے کچھ لوگ وہ ہیں جنہیں کل کو آتشِ دوزخ میں ڈالا جائے گا)۔ مہدی کے ایک حاشیہ بردار کاتب (سکرٹری) ابو عبید نے کہا: "امیر المومنین کے سامنے ایسی بات کہی جا رہی ہے"؟ حضرت سفیان ثوریؒ نے مومنانہ طاقت اور ایک مسلمان کی غیرت کے ساتھ جواب دیا: چپ رہ، فرعون نے ہامان کو اور ہامان نے فرعون کو اسی طرح برباد کیا تھا! یہ کہہ کر حضرت سفیان باہر چلے آئے۔[1] (باقی)

---

[1] سراج الملوک ص ۵۱۔

قیام للغیر کا جواز و عدمِ جواز

(ملک غلام علی صاحب)

ایک صاحب لکھتے ہیں:-

اُستاد کے لیے مدارس میں تعظیماً کھڑے ہونے کے سلسلہ میں یہاں اختلاف پیدا ہو گیا ہے مشکوٰۃ میں بروایت حضرت ابو سعید خدریؓ نبی صلی اللہ علیہ وسلّم نے خود تعظیم کے لیے کھڑا ہونے کا حکم دیا ہے اور حضرت فاطمہؓ کے لیے بھی آنحضورؐ کا کھڑا ہونا ثابت ہے۔ دوسری طرف ترمذیؒ کی صحیح حدیث میں صحابۂ کرامؓ کا آپؐ کے لیے کھڑا نہ ہونا، حضرت معاویہؓ کی روایت میں قیام پر جہنّم کی وعید ہونا اور حضرت ابو اُمامہ والی روایت میں اسے عجمی طریقہ قرار دے کر منع کرنا ثابت ہے۔ بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ حضرت سعدؓ کے لیے آنحضورؐ نے قُومُوْا لِسَیِّدِکُمْ نہیں فرمایا تھا، بلکہ قُومُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ فرمایا تھا۔ حضرت سعدؓ خود سواری سے اُترنے میں معذور تھے، اس لیے ان کی مدد کے لیے کھڑا ہونے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس معاملے میں صحیح رہنمائی اور تطبیق کی ضرورت ہے۔ یہ مسئلہ مدارس تک محدود نہیں، بلکہ زندگی کے اکثر مواقع پر اس سے سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ اس لیے اس معاملے کی شرعی حیثیت اور اسلامی احکام کا صحیح منشا متعین ہو جائے تو بار بار اُلجھن اور بحث کی صورت پیدا نہ ہو گی۔

یہ ان بہت سے سوالات میں سے ایک ہے جو اس مسئلے کے متعلق ہمارے ہاں وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ اس لیے یہاں اُسے درج کر کے تفصیل کے ساتھ اس کا تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے۔

ائمہ سلف میں قیام کا مسئلہ مختلف فیہ ہے۔ بعض جواز کے قائل ہیں، بعض مطلقاً عدمِ جواز کے قائل ہیں اور بعض کے نزدیک قیام کی کچھ خاص صورتیں ایسی ہیں جو جائز و مباح ہیں اور بعض دوسری ایسی ہیں

جو ممنوع ہیں۔ ہر مسلک کے حق میں دلائل موجود ہیں اور جب تک انہیں اختصار کے ساتھ بیان نہ کر دیا جائے ان کے مابین موازنہ نہیں ہو سکتا۔

جواز کے قائلین متعدد احادیث و آثار پیش کرتے ہیں جن سے قیام کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک تو صحیحین وسنن کی وہی حدیث ہے جس کا ذکر سوال میں کیا گیا ہے۔ اس میں آیا ہے کہ بنو قریظہ کے یہود نے مغلوب ہو جانے کے بعد حضرت سعدؓ بن معاذ کو اپنے معاملے میں حکم بنایا تھا۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بلوا بھیجا۔ جب حضرت سعدؓ سوار ہو کر سامنے سے نمودار ہوئے تو آنحضورؐ نے صحابۂ کرامؓ سے فرمایا قُومُوا الیٰ سیدکم (اٹھو اپنے سردار کی جانب)۔ ابوداؤد اور بعض دوسری کتب حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے اپنے رضاعی والدین کے لیے چادر بچھائی اور اپنے رضاعی بھائی کے لیے آپ کھڑے ہو گئے، پھر پاس بٹھایا۔ اسی طرح سنن ابی داؤد، ترمذی، ابن حبان وغیرہ میں متعدد روایات موجود ہیں کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہؓ کے ہاں تشریف لے جاتے تھے تو آپ کھڑی ہو کر آپ کا دستِ مبارک لے کر چوم لیتی تھیں اور پھر آپ کو اپنی نشست پر بٹھاتی تھیں۔ اسی طرح جب وہ آنحضورؐ کے پاس جاتی تھیں تو آپ بھی ایسا ہی کیا کرتے تھے۔

حضرت عکرمہ رضی اللہ عنہ کے بارے میں بھی حدیث میں آیا ہے کہ فتح مکہ کے بعد وہ ایسے بددل ہوئے کہ ترکِ وطن کے ارادے سے ساحل سمندر پر پہنچے اور ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔ کشتی بھنور میں پھنس گئی تو اہلِ کشتی میں سے کسی نے بتوں کو مدد کے لیے پکارا۔ مگر دوسروں نے کہا کہ اس نازک گھڑی میں بت کام نہیں آ سکتے فقط اللہ وحدہٗ کو پکارو۔ بس یہی بات عکرمہ کے دل میں بیٹھ گئی اور آپ نے سوچا کہ پھر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہی کا دین سچا ہے اور آپ دوسری کشتی میں واپس ہو کر آنحضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس وقت آنحضورؐ ان کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت عدی بن حاتم کے لیے بھی اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا قیام حدیث میں مذکور ہے۔ یہاں ان تمام احادیث کا استقصاء مقصود نہیں ہے، جن سے جوازِ قیام ثابت ہوتا ہے ورنہ بعض دیگر روایات و آثار بھی اس ضمن میں موجود ہیں۔ مثلاً بیہقی میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ملتی ہے کہ آنحضورؐ مسجد سے تشریف لے جاتے تو صحابۂ کرام کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ اسی طرح جب حضرت کعب ابن

مالک اور ان کے دو ساتھی جو تساہل کی بنا پر جنگ تبوک سے رہ گئے تھے، ان کی توبہ جب اللہ نے قبول فرمائی اور حضرت کعب خدمت نبوی میں حاضر ہوئے تو ایک صحابی ان کے استقبال اور خوش آمدید کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ حضرت کعب کے نزدیک ان صحابی کا قیام ایسا احسان تھا جو ان کے لیے ہمیشہ ناقابل فراموش اور واجب الامتنان رہا۔ بہرکیف اس امر سے انکار ممکن نہیں ہے کہ متعدد احادیث جواز قیام پر دلالت کرتی ہیں۔

جن حضرات کے نزدیک قیام ممنوع یا مکروہ ہے، وہ بھی اپنے حق میں بعض دوسری احادیث سے استدلال کرتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔ سنن ابن ماجہ و ابی داؤد میں وارد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عصائے مبارک کا سہارا لیے ہوئے گھر سے باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام آپ کے لیے کھڑے ہو گئے۔ تو آپ نے فرمایا: "اس طرح مت کھڑے ہوا کرو جس طرح عجمی لوگ ایک دوسرے کے لیے کھڑے ہوتے ہیں۔" سنن ترمذی، ابی داؤد وغیرہ میں حدیث ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من احب ان یتمثل لہ الرجال فلیتبوأ مقعدہ من النار (جس شخص کو یہ پسند ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوا کریں۔ اس کے لیے دوزخ واجب ہو گئی۔) حضرت انسؓ سے ایک روایت ترمذی میں مروی ہے کہ "صحابہ کرام کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑھ کر کوئی شخصیت محبوب نہ تھی، لیکن وہ آنحضورؐ کو دیکھ کر کھڑے نہیں ہوتے تھے کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ آپ اسے ناپسند فرماتے ہیں۔" حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک مرتبہ وہ حضرت عبداللہ بن زبیر اور ابن صفوان کے سامنے برآمد ہوئے تو یہ دونوں اصحاب یا ان میں سے ایک کھڑے ہو گئے۔ حضرت معاویہؓ نے فرمایا: "تشریف رکھیے، میں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا ہے: من سرہ ان یتمثل لہ الرجال قیاماً فلیتبوأ مقعدہ من النار (جس شخص کو اس بات سے خوشی ہوتی ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں وہ آگ میں اپنا ٹھکانا بنا لے) صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل فارس و روم کے اس طریقہ سے منع فرمایا کہ وہ اپنے بادشاہوں کے آگے کھڑے ہوتے ہیں۔

جن حضرات کے نزدیک قیام ممنوع ہے وہ احادیث مذکورہ کو اپنی تائید میں پیش کرنے کے علاوہ جواز قیام پر دلالت کرنے والی احادیث کی بھی ایسی تاویل و تفصیل بیان کرتے ہیں جن سے جواز مشتبہ ہو جاتا

ہے۔ مثال کے طور پر حضرت سعد بن معاذ والی حدیث کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں کہ جنگ خندق میں زخمی ہونے کی وجہ سے حضرت سعد کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ امداد کے بغیر سواری سے خود بخود اتر سکتے۔ اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ وہ اُٹھ کر انہیں اتاریں۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضورؐ نے قُومُوا لسید کم نہیں فرمایا بلکہ قوموا الی سیدکم فرمایا جس کا مطلب یہ نہ تھا کہ ان کی تعظیم یا استقبال کے لیے اٹھو، بلکہ مراد یہ تھی کہ اترنے میں ان کی مدد کرو۔ اسی طرح بعض حضرات نے محبت اور تعظیم یا اکرام اور اعظام میں باریک فرق پیدا کر کے ایک کے لیے قیام کو مباح اور دوسرے کے لیے ممنوع قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض کا قول یہ ہے کہ مجلس میں جگہ خالی کرنے اور توسیع پیدا کرنے کے لیے کھڑے ہونا جائز ہے یا جو شخص سفر کر کے آیا ہو اس کے لیے قیام درست ہے، ورنہ مکروہ ہے۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ اگر خدمت یا تالیف قلب کے لیے قیام ناگزیر ہو تو جائز اور مباح ہے ورنہ نہیں۔

جواز و عدم جواز دونوں کے حق میں دلائل کا خلاصہ کم و بیش یہی ہے جو اوپر بیان کر دیا گیا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حقیقت نفس الامر کیا ہے؟ شارع علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے ارشادات اور اسوۂ حسنہ کا اصل مقتضی کیا ہے؟ کیا آپ نے ایک شخص کے لیے دوسرے کے قیام کو مباح یا مندوب قرار دیا ہے یا ممنوع ٹھیرایا ہے یا حاشا و کلا آپ کے اقوال و افعال میں تعارض کا کوئی ایسا پہلو ہے جسے رفع کرنا ممکن نہیں ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ درحقیقت اس مسئلے میں وارد شدہ احادیث و آثار میں کوئی تخالف و تعارض نہیں ہے۔ سب کا اپنا اپنا ایک موقع اور محل ہے جس پر الگ الگ حکم کا انطباق ہوتا ہے۔ قیام کو علی الاطلاق مشروع یا ممنوع قرار دینے میں افراط و تفریط کا شائبہ پایا جاتا ہے اور شریعت کا اقتضاء ان کے بین بین ہے۔ جملہ احادیث کا اگر غور و تامل کے ساتھ مطالعہ کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی کے لیے لوگوں کا قیام اقتدار پرستی کا مظہر ہو اور وہ شخص خود بھی اس بات کا خواہاں ہو کہ لوگ اس کے لیے کھڑے ہوں تو ایسی صورت میں یہ فعل ممنوع اور مبغوض ہے۔ اسی طرح اگر یہ فعل ایک جانب سے تملق و تذلل اور دوسری جانب سے استعلاء و استکبار کے جذبے پر مبنی ہو، تب بھی یہ جانبین کے حق میں مکروہ و مذموم ہو گا۔ لیکن ان کے ماسواء دوسری جتنی صورتیں بھی قیام کی ہوں گی، ان کے ممنوع ہونے کے حق میں کوئی مضبوط استدلال نہیں کیا جا سکتا اور وہ ساری حد جواز میں آ سکتی ہیں۔ بلکہ اگر وہ شخص جس کے لیے قیام کیا جائے، اسلام کے معیار اور نقطہ نظر سے اس کا مستحق اور سزاوار ہو تو بعض مواقع پر یہ قیام پسندیدہ اور مطلوب

ہو گا۔ یہ ایک معتدل اور قابلِ ترجیح مسلک ہے جسے متعدد ائمہ و فقہاء نے اختیار کیا ہے۔ امام خطابی ابو داؤد کی شرح معالم السنن میں فرماتے ہیں:

قیام المرؤس للرئیس الفاضل وللوالی العادل وقیام المتعلم للعالم مستحب غیر مکروہ۔ انما جاءت الکراھۃ فیمن کان بخلاف ھذہ الصفات "ماتحت کا صاحبِ فضیلت سردار اور عادل والی کے لیے قیام اور متعلم کا عالم کے لیے قیام مستحب ہے، مکروہ نہیں۔ کراہتِ قیام صرف اس شخص کے بارے میں ہے جس میں یہ صفات نہ ہوں"۔ حافظ منذری نے اپنی مختصر ابی داؤد کے حواشی میں امام خطابی کے اس قول کو توثیقاً نقل کیا ہے کہ کبر و نخوت کی بنا پر لوگوں کو قیام کا حکم دینا اور ان پر اسے لازم کرنا منع ہے ورنہ اکثر محققین کے نزدیک اہلِ خیر کے لیے قیام مکروہ نہیں۔ امام بخاری اور امام نوویؒ کا رجحان بھی اسی طرف ہے، بلکہ امام نوویؒ نے جوازِ قیام کے حق میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ حنفی فقہاء کا بھی بالعموم مسلک یہی ہے کہ جو شخص قابلِ تعظیم ہے اس کے لیے قیام تعظیمی جائز ہے۔

جن احادیث میں ممانعتِ قیام وارد ہے ان میں اکثر ایسی ہیں جن میں قیام کی اُس نہی علت کو ظاہری ہیئت پر بطور خاص و دیگر سے نمایاں فرمایا گیا ہے جو قیام کو قابلِ ممانعت بنا دیتی ہے اور وہ یہ ہے کہ لوگوں میں ذہنی غلامی اور مرعوبیت پیدا کرنے، اپنی بڑائی کا سکہ بٹھانے اور خدائی کے ٹھاٹھ جمانے کے لیے اس رسم کا التزام کیا جائے۔ ایک حضرت اپنی مسند پر براجمان ہوں اور دوسرے ان کے حضور میں دست بستہ، صامت و ساکت، سرو قد کھڑے ہوں، یہ چیز بلاشبہ مراسمِ عبودیت میں داخل اور وَقُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ کے حدود سے متصادم ہو جاتی ہے۔ چنانچہ احادیث میں جس شخص کے لیے قیام کی ممانعت و وعید وارد ہے اس کے لیے یہ الفاظ بھی آتے ہیں: من احب ان یستجم لہ الرجال صفوفاً (جو شخص اسے پسند کرے کہ لوگ جوق در جوق صف بستہ ہو کر اس کے لیے کھڑے رہیں)۔ بعض روایات میں یستجم کے بجائے یستخم (ج کی جگہ خ)، اور صفوفاً (ف) کے بجائے صفونًا (ن) ہے۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لوگ کھڑے کھڑے اکتا جائیں اور ان کی ٹانگیں تھک جائیں، حتیٰ کہ وہ جانوروں کی طرح اپنی ایک ٹانگ اٹھا کر سستانے کی کوشش کریں۔ بعض روایات میں "من سرہ ان یتمثل لہ الرجال قیاماً" کے الفاظ ہیں۔ اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ لوگ بُت بنے اس کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے رہیں۔

جن اصحاب نے حضرت سعدؓ ابن معاذ والی حدیث کی یہ توجیہ کی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے محض انہیں سواری سے اتارنے کے لیے قیام کا حکم دیا تھا اور اس سلسلے میں قوموا لہ اور قوموا الیہ کے مابین امتیاز قائم کیا گیا ہے، ان کا استدلال زیادہ وزنی بنیاد پر قائم نہیں ہے۔ مان لیا کہ حضرت سعد مجروح اور علیل تھے لیکن وہ مدینے سے بنو قریظہ تک سوار ہو کر بہرحال پہنچ گئے تھے۔ وہاں گدھے پر سے اترنا ان کے لیے شاید اتنا دشوار نہ تھا کہ وہ لازماً سہارے کے محتاج ہوتے۔ پھر جب وہ سامنے سے سوار نمودار ہوتے تو آنحضورؐ نے ان کو نام سے پکارنے کے بجائے سیدکم یا خیرکم کے الفاظ و القاب استعمال فرمائے جو اس امر کا نہایت قوی قرینہ ہیں کہ آپ اس حقیقت کی جانب صحابۂ کرام کو متوجہ فرمانا چاہتے تھے کہ یہ تمہارے ایک محترم اور ذی مرتبہ قائد اور سردار ہیں جو ایک بہت اہم معاملے میں ثالث اور حَکَم کے فرائض سرانجام دینے کے لیے آرہے ہیں، اس لیے تم آگے بڑھ کر ان کا استقبال اور پذیرائی کرو اور یہود کو یہ خیال کرنے کا موقع نہ دو کہ تم اپنے اہل عزت و شرف کی قدر نہیں پہچانتے۔ اس باب کی چند روایات میں انزلوا کا ارشادِ نبوی بھی نقل ہوا ہے جس کا مطلب بعض شارحین نے پھر یہی لیا ہے کہ سعد بن معاذ کو پکڑ کر سواری سے اتارو، حالانکہ اس کا بھی زیادہ صحیح مطلب تشریف و تکریم اور خوش آمدید ہی ہے اور دوسری حدیث انزلوا الناس منازلھم (لوگوں کی شایانِ شان پذیرائی اور تواضع کرو) اسی مفہوم پر شاہد ہے۔

فعل قیام کے بعد ل اور الیٰ کے صلوں میں جو فرق بیان کیا گیا ہے لغت کے اعتبار سے بھی وہ کوئی قطعی اور حتمی چیز نہیں ہے۔ قام الیٰ کے معنی لازماً یہ نہیں ہیں کہ کسی محتاج اعانت کو تھامنے یا اُسے مدد پہنچانے کے لیے آگے بڑھا جائے جس طرح مجرد اظہارِ محبت و تعظیم یا خوش آمدید کے لیے کھڑا ہونے یا پیش قدمی کرنے کے لیے قام لہٗ کا محاورہ مستعمل ہے، اسی طرح قام الیہ بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس کی متعدد مثالیں احادیث ہی میں مل سکتی ہیں۔ سنن ترمذی میں مروی ہے کہ حضرت زیدؓ بن حارثہ مدینے پہنچے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا درِ مبارک جا کر کھٹکھٹایا تو اس کے بعد متن کے الفاظ ہیں: فقام الیہ النبی صلی اللہ علیہ وسلم یجر ثوبہ فاعتنقہ وقبلہ (پس آنحضورؐ اپنی چادر سمیٹتے ہوئے اٹھ کر ان کی طرف بڑھے، انہیں گلے لگایا اور چوما)۔ ظاہر ہے کہ یہاں سہارا دینے یا تھام کر مدد دینے کا کوئی موقع نہ تھا، جیسا کہ حضرت سعدؓ کے واقعے میں گمان کیا گیا ہے۔ یہ محض پُرتپاک گرمجوشی اور استقبال کا اظہار تھا جس کے لیے قام الیہ کے الفاظ آئے ہیں۔ حضرت ابو اُمامہ سے ایک

حدیث ابوداؤد اور ابن ماجہ میں مروی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ اس کے الفاظ ہیں خرج علینا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ... فقمنا الیہ۔ یہاں پھر وہی الفاظ مستعمل ہیں۔ اسی طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت فاطمہؓ کے باہمی ایک دوسرے کو دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہونے کی حدیث جو اُوپر بیان ہوئی ہے، اس میں بھی حضرت عائشہؓ سے جو الفاظ ابوداؤد میں مروی ہیں وہ ہیں: کانت اذا دخلت علیہ قام الیھا.... واذا دخل علیھا قامت الیہ۔ یہاں بھی دونوں جگہ قام کے ساتھ الیٰ آیا ہے، حالانکہ یہ قیام بھی بلاشک و شبہ خالص محبت و احترام کی بنا پر ہوتا تھا۔

اتنی بحث کے بعد اب صرف ایک ضروری سوال حل طلب باقی رہ جاتا ہے اور وہ یہ ہے کہ اگر قیام محض اس حالت میں ممنوع ہے جب ایک طرف تعبد و تذلل اور دوسری طرف استبداد و استکبار کا جذبہ کارفرما ہو تو پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لیے قیام کو پسند کیوں نہیں فرمایا؟ حالانکہ آپؐ اور صحابہ کرام کے معاملے میں کسی طرح ایسے جذبات کی موجودگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ اس سوال کے مختلف جواب ممکن ہیں، لیکن مَیں طوالت سے بچنے کے لیے صرف اس جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ صحابہ کرام کے کھڑا ہونے پر آنحضورؐ کی ناپسندیدگی کی نوعیت شرعی و تحریمی کراہت کی نہیں تھی، بلکہ یہ ایک طبعی ناگواری اور عادی کراہت کا اظہار تھا۔ لیکن صحابہ کرام چونکہ آپؐ کی خوشنودیٔ طبع کے منافی کسی ادنیٰ سے ادنیٰ فعل کے بھی روادار نہیں تھے، اس لیے بالعموم آپؐ کے لیے قیام سے اجتناب کرتے تھے۔ شمائل نبوی میں ترکِ اختیار کے بعض دیگر پہلو بھی ایسے ہیں جنہیں آپؐ کے خصائص میں شمار کیا گیا ہے اور امر و نہی کے دائرے میں شامل نہیں سمجھا گیا۔ مثال کے طور پر آنحضورؐ چلتے ہوئے دوسروں سے آگے آگے رہنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اس سے کوئی حکم شرعی مستنبط نہیں ہوتا، اگرچہ اس میں تواضع اور عدمِ تکلف کی شان پائی جاتی ہے۔ یہی صورت قیام کی بھی ہے۔ آپؐ نے یہ نہیں فرمایا کہ میرے لیے قیام حرام یا موجب وعید ہے۔ البتہ وہ شکل یا وہ علت جو اسے حرام بنا دیتی ہے اُسے واضح فرما دیا۔ اس کے ساتھ بعض حالات میں قیام کو اپنے لیے گوارا اور دوسروں کے حق میں پسند بھی کیا ہے، بلکہ حوصلہ افزائی بھی فرمائی ہے تاکہ یہ حرماتِ قطعیہ کی قبیل میں داخل نہ ہو جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام نے اہل فضل کے احترام، سن رسیدہ (ذی شیبہ) کے اکرام، توقیر کبیر، رأفت و رحمت علی الصغیر وغیرہ کے جو اصولی اور عمومی احکام دیئے ہیں ان کے پیش نظر یہ امر ناقابلِ یقین اور محال ہے کہ ادب یا دلی محبت و تعظیم کا جو مظاہرہ بے اختیار قیام کی صورت اختیار کر لیتا ہے وہ اسلام میں ممنوع ہو۔

شراب اور قمار

(جناب ریاض الحسن صاحب)

(۴)

اب تک گیمبرز (GAMES OF CHANCE) کے متعلق جو کچھ کہا جا چکا ہے اس سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کی رُو سے ممنوع ہونے کے ساتھ ساتھ جدید سائنسی تحقیقات کی رُو سے بھی قمار نہ صرف مالی اور معاشی اعتبار سے انسان اور معاشرے کے لیے تباہ کن ہے بلکہ ذہنی، نفسیاتی اور روحانی لحاظ سے اور بھی زیادہ ہلاکت خیز ہے۔ یہ انسان کو بغیر محنت و مشقت کے مال حاصل کرنے کی امید دلاتا ہے اور اس کی کوششیں محنت کے بجائے چالبازیوں پر صرف ہونے لگتی ہیں۔ وہ چاہنے لگتا ہے کہ بس ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ چوکھا آئے۔ اس طرح سے ایک ایسی مسخ شدہ ذہنیت جنم لیتی ہے جو صرف قمار بازی تک محدود نہیں رہتی۔ پھر یہی ذہنیت رشوت خوری، سمگلنگ، چور بازاری وغیرہ کی راہ سُجھاتی ہے اور اگر یہ ذہنیت زیادہ بگڑ جاتے تو پھر لوگ معصوم بچوں تک کو پکڑ کر فروخت کرنے کی انسانیت سوز حرکتیں بھی کرنے لگتے ہیں۔ کیونکہ وہ آسانی سے اور جلدی سے جلدی مال حاصل کرنے کے حریص اور طالب ہوتے ہیں۔ یہی ذہنیت جب طالب علموں میں نمودار ہوتی ہے تو وہ اپنا وقت تعلیم سے زیادہ اس فکر میں گزارتے ہیں کہ کس طرح پڑھائی اور علم حاصل کرنے کی مشقت اٹھائے بغیر امتحان میں آسانی سے کامیاب ہو جائیں۔ یہ لوگ ایسے نت نئے ناجائز طریقوں پر غور کرتے رہتے ہیں جن سے ان کو بغیر استحقاق کے آسانی سے ڈگریاں مل سکیں۔ پھر جب کامیاب ہو کر نوکری کی تلاش میں نکلتے ہیں تو سفارش اور رشوت وغیرہ کا سہارا ڈھونڈتے ہیں اور ناجائز طریقوں پر آس لگاتے ہیں۔ اگر کاروبار یا تجارت کو اپناتے ہیں تو وہاں بھی فریب، چور بازاری اور دھوکہ دہی کے ذریعہ سے روپیہ بٹورنے کی فکر کرتے ہیں اور جلدی سے جلدی امیر بننا چاہتے ہیں۔ یہ تجارت کو بھی ایک لاٹری سمجھ بیٹھتے ہیں۔

خریداروں کو ناقص مال فراہم کر کے آسانی سے دولت کمانے کی راہ سوچتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی ذہنیت کی بنا پر پاکستانی صنعت کاروں اور تاجروں کی ساکھ کو بین الاقوامی منڈیوں میں نقصان پہنچا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جس مسخ شدہ ذہنیت کا ہم ذکر کر رہے ہیں، یہ نہ صرف دنیا میں بغیر سعی صادق کے مال اور دیگر دنیاوی فوائد حاصل کرنا چاہتی ہے، بلکہ آخرت کے لیے بھی بجائے مکمل طور پر عمل صالح کی کٹھن راہ پر چلنے کے صرف چند وظیفوں یا کسی بزرگ سے محض عقیدت کی بنا پر جنت حاصل کرنے کی متمنی ہوتی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے صاف فرمایا ہے لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ۔ جنت یونہی نہیں مل جاتی ہے، بلکہ اس کا استحقاق پیدا کرنے کے لیے عمر بھر احکامِ الٰہی کی اطاعت، حرام و حلال کی تمیز، اور خواہشاتِ نفس کے خلاف جدو جہد کرنی پڑتی ہے۔

تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ تنہا افراد ہی اس خرابی کے ذمہ دار نہیں ہیں بلکہ حکومت اور معاشرے کا نظام بھی اسے پرورش کر رہا ہے۔ ہمارے ملک میں گھوڑوں کی ریس پر جوا کھیلا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کلبوں وغیرہ میں ہوزی اور دیگر طرح طرح کے جوّے کھیلے جاتے ہیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ پرائز بانڈز کی شکل میں کھلم کھلا جوا ہو رہا ہے۔ خود سرکاری تصریح کے مطابق تمام بانڈ خریدنے والوں کی رقم کا سود ایک جگہ جمع کر لیا جاتا ہے، پھر حساب کے کھاتے میں اس کی چھوٹی بڑی ڈھیریاں لگا کر میسر کے ذریعے ان کی تقسیم ہوتی ہے جس میں کسی سعی یا جائز استحقاق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طرح سود کے مال حرام کو میسر کے طریقِ حرام سے تقسیم کیا جاتا ہے جو حرام در حرام ہوا، اور اس ذریعہ سے چند آدمیوں کو جو کثیر رقوم ملنے کا امکان پیدا ہوتا ہے اس کا لالچ دے کر بانڈس کی فروخت بڑھائی جاتی ہے تاکہ پوری قوم میں قمار بازانہ ذہنیت پیدا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ بالفرض اگر ان بانڈس کا منافع حرام قسم کا سود نہ بھی ہو بلکہ ایک جائز منافع ہی ہو تو اس کے تمام سرمایہ کاروں کو اپنے اپنے سرمایہ کے تناسب سے اس منافع کا حصّہ ملنا چاہیے۔ آخر قرآن و سنت یا عدل و انصاف کی کس دلیل سے اس کو ڈھیریاں لگا کر میسر کے طریقے پر تقسیم کیا جاتا ہے؟ ذرا سوچیے کہ اگر کچھ روپیہ جس کے جائز وارث موجود ہوں، ایک جگہ جمع کیا جائے اور پھر اس کی ڈھیریاں لگا کر میسر کے طریقے پر اسے تقسیم کیا جائے جس سے وارثوں کی اکثریت کو ایک حبہ بھی نہ ملے اور گنتی کے چند ورثہ ایک اتفاقی حادثے کی بنا پر سب کے

حصے کا مال پا جائیں تو کیا کسی علمی دلیل یا کسی تصورِ انصاف کی رُو سے بھی اسے جائز قرار دیا جا سکتا ہے؟ کیا یہ پوری سکیم لوگوں کو سعی کی راہ سے ہٹا کر قمار کی راہ پر نہیں ڈال رہی ہے؟ کیا اسی طرح یہ بھی جائز ہوگا کہ ایک کارخانے کے تمام مزدوروں کی اُجرتیں ایک جگہ جمع کر لی جائیں اور پھر ڈھیریاں لگا کر میسر کے طریق پر صرف گنتی کے چند مزدوروں میں انہیں بانٹ دیا جائے؟ زمانۂ جاہلیت کے میسر میں تو فقراء و مساکین کو نہ صرف حصہ ملتا تھا بلکہ سارا جیتا ہوا مال غریبوں ہی کو کھلا دیا جاتا تھا۔ مگر یہ بیسویں صدی کا میسر اس ظاہری خیر سے بھی خالی ہے۔

ہمارے ہاں ایک طبقہ ایسا بھی پایا جاتا ہے جو سرے سے زندگی ہی کو ایک جُوا سمجھتا ہے۔ اسی نظریہ اور کردار کی تبلیغ ہماری فلمیں کرتی ہیں۔ مثلاً ایک فلمی گانا ہے۔

زندگی ہے اک جُوا اور تُو دیکھتا ہے کیا

آگے بڑھ کے اپنی جان داؤ پر لگائے جا

یہ فلمیں بھی حکومت کے سنسر بورڈ سے پاس ہو کر ہی دکھائی جاتی ہیں اور قوم کے کردار بنانے میں فلم، ریڈیو اور ٹیلی ویژن کا جو مقام ہے وہ کسی ذی فہم سے پوشیدہ نہیں ہے یہی چیزیں قوم کے کردار کو بلند کرنے کے لیے بھی استعمال ہو سکتی تھیں۔ لیکن جن کا نظریہ حیات ہی جُوا ہو ان کو بھلا ان باتوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے۔

ہمارے ہاں تو ابھی قمار اور شراب کی یہ تہذیب ابتدائی مراحل میں ہے، مگر جن ممالک میں یہ اپنے کمال کو پہنچ گئی ہے وہاں جس نسبت سے اس کو فروغ نصیب ہوا ہے اُسی نسبت سے یاس اور نا امیدی بھی کثرت سے پھیلی ہوئی ہے۔ جس کا اندازہ ان ممالک میں مُسکرات اور مُسکِنات (TRANQUILIZERS) کے استعمال کی کثرت اور خودکشی وغیرہ کے واقعات سے ہو سکتا ہے۔ بقولِ غالب ؏

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید

نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ہر منٹ کوئی نہ کوئی خودکشی کر کے مر جاتا ہے یا خودکشی کی کوشش کرتا ہے۔ ماہرین کا کہنا ہے کہ وہاں سالانہ پچاس ہزار آدمی خودکشی سے مر جاتے ہیں۱ (یعنی روزانہ اندازاً ۱۳۰ آدمی

۱ "CLIFFS TO SUICIDE" BY SHNEIDMAN AND FARBEROW PAGE 187

انگلینڈ اور ویلز میں سالانہ تیس سے چالیس ہزار تک آدمی خودکشی کے ذریعہ اپنی جان گنوا دیتے ہیں۔ خودکشی کی ناکام کوشش کرنے والوں کی تعداد اس سے ۶ تا ۔ اگنی زیادہ قیاس کی جاتی ہے۔ یعنی امریکہ میں سالانہ ۴ تا ۵ لاکھ اور انگلینڈ و ویلز میں ۳ تا ۴ لاکھ انسان ناامیدی کی حالت میں زندگی سے بیزار ہو کر موت کو ترجیح دیتے ہوئے خود کو ہلاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں[1]۔ ان ممالک میں زندگی اس قدر پریشانیوں، غموں، اور دکھوں سے بھری ہوئی ہے کہ ماہرین اس پر تحقیقات کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں۔

فارنہیم اور لنڈبرگ (LUNDBERG AND FARNHAM M.D) لکھتے ہیں:

"اگرچہ مادی ترقی ان بلندیوں تک پہنچ چکی ہے کہ ڈیڑھ سو سال پہلے اس کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بیماری اور وبائیں اس درجہ کم ہو گئی ہیں کہ امید بھی نہ تھی۔ اور جبکہ مادی طور سے لطف اندوزی کے ساز و سامان اور طریقے ہمارے چاروں طرف اس طرح بکھرے پڑے ہیں کہ پہلے اندازہ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ بایں ہمہ موجودہ زمانہ جہاں تک جذبات اور محسوسات کا تعلق ہے، انسانی تاریخ میں یہ غالباً سب سے زیادہ غم، رنج اور پریشانی کا زمانہ ہے[2]"

اس بات کا احساس مغربی ماہرین اور عقلاء کو بُری طرح کھائے جا رہا ہے۔ مثلاً جون رابنسن (JOAN ROBINSON) اپنی کتاب "معاشی فلسفہ" کو شروع ہی اس ذکر سے کرتی ہے:

"ایک وجہ اس بات کی کہ موجودہ زندگی کیوں اس قدر تکلیف دہ ہے یہ ہے کہ ہمیں ان باتوں کے متعلق بھی احساس خودشعوری ہو گیا ہے جو مصدقہ حقیقتیں سمجھی جاتی تھیں[3]"

جوئے اور شراب وغیرہ کی اس تہذیب میں ذہنی امراض جس کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اس کے متعلق فارنہیم اور لنڈبرگ لکھتے ہیں[4]:

---

[1] SUICIDE AND ATTEMPTED SUICIDE BY STENGEL PAGE 75, 76

[2] MODERN WOMAN, THE LOSTSEX BY LUNDBERG AND FARNAM M.D. P 22

[3] ECONOMIC PHILOSOPHY BY JOAN ROBISON

[4] MODERN WOMAN P. 416, 417

"ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ امریکہ میں ۲۵ سے ۳۳ فی صد تک ایسے بالغ لوگ آباد ہیں جن کے ذہنی امراض اس درجہ کو پہنچے ہوئے ہیں کہ ان کو ڈاکٹری علاج کی ضرورت ہے ... مزید برآں ہم یہ نتیجہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ امریکہ میں ۲۵ سے ۳۳ فیصد مزید ایسے لوگ ہیں جو اعصابی اور ذہنی بنا پر تکلیف وہ زندگی گزار رہے ہیں۔"

آخر میں یہ دونوں مصنفین یہ قیاس کرتے ہیں کہ امریکہ میں مشکل سے ۳۲ تا ۵۰ فیصد ایسے لوگ ہوں گے جو ان امراض سے محفوظ کہے جا سکیں۔ پھر یہ لکھتے ہیں کہ ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ قوم کو تشویشناک حالات کا سامنا ہے۔ بالفاظ دیگر موجودہ کلچر نے امریکہ کی آبادی کو اس قدر دکھوں اور غموں سے پُر کر دیا ہے کہ ان کی آدھی سے زیادہ آبادی ان پریشانیوں کی تاب نہ لا کر ذہنی عوارض میں مبتلا ہو چکی ہے۔ اور باقی کا حصہ ذہنی دفاع کی جنگ میں مصروف ہے لیکن ابھی تک ہتھیار ڈالنے کی نوبت نہیں آئی ہے۔ یہ لوگ خوشی کی تلاش میں مارے مارے پھرتے ہیں لیکن خوشی کے بجائے موت سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ کوئی ان میں سے اٹھ کر آٹھ بے گناہ نرسوں کو بیئر کے نشے میں قتل کر دیتا ہے۔ دوسرا ٹکساس (TEXAS) شہر کے گھنٹہ گھر پر چڑھ کر راہ گیروں میں سے بارہ عورتوں اور مردوں کو گولی کا نشانہ بنا دیتا ہے[1]۔

ان کے بچے کسی طرح یہ دریافت کر لیتے ہیں کہ کھلونے کے جہاز جوڑنے والی سریش (گوند) نشہ پیدا کرتی ہے۔ اس کے بعد اس کو استعمال کرنے کی وبا بچوں میں عام ہو جاتی ہے۔ اس عادت کے متعلق سلبی (SELBY) لکھتا ہے[2]:

"کوئی یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ ایسی بے مزہ عادت اس طرح پھیل جائے گی۔ آج یہ سریش بچوں میں نشہ کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ بلوغ کے قریب لڑکوں اور لڑکیوں میں خودکشی کی واردات کا تعلق نشہ آور چیزوں سے جڑا ہوا ہے۔ سریش سونگھنے کی عادت بہت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔

---

[1] LIFE AUGUST 22, 1966

[2] PILLS, GLUE AND KIDS: AN AMERICAN TRAGEDY, ARTICLE BY SELBY IN READER DIGEST JULY 1966 PAGES 30, 31

یہ عادت بہت کم عمر کے بچے بھی اختیار کر لیتے ہیں حتیٰ کہ سات سالہ بچے بھی اس لت میں مبتلا پائے گئے ہیں۔ پولیس کے ریکارڈ آف جرائم سے بھرے پڑے ہیں جو اس سرنش کے سونگھنے والے کرتے ہیں۔ ان جرائم میں اکثریت کار چرانے اور زنا بالجبر کی ہوتی ہے۔

شکاگو میں تین نوجوانوں نے نشے کی گولیوں کے اثر میں ایک ۶۳ سالہ بڈھے کو گولی ماری اور پھر جب وہ سڑک کے کنارے زخمی پڑا تھا تو اس کو کندے مار مار کر مار ڈالا۔ یہ بالکل بے مقصد قتل تھا اور صرف لطف اندوزی کے لیے کیا گیا تھا۔"

بعض نوجوان مزا لینے کے لیے معصوم چھوٹے بچوں کو طرح طرح سے اذیت دے کر مار ڈالتے ہیں اور ان کی آہ و زاریوں اور چیخوں کی آوازوں کو ٹیپ کرتے ہیں اور مختلف حالتوں کی تصاویر لیتے ہیں۔ اخبار نویسوں کا بیان ہے کہ ان ٹیپ ریکارڈوں کا سننا ان کی زندگی کا سب سے ڈراونا تجربہ تھا۔[1]

میریلین مونرو (MARILYN MONROE) مشہور ایکٹرس کی زندگی بچپن سے ہی دکھوں سے بھری تھی۔ اس نے دکھوں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تگ و دو کر کے شہرت حاصل کی۔ دنیا اس کو ہنستی اور چہکتی دیکھ کر رشک کرتی۔ لیکن اس کو کسی طرح خوشی نصیب نہ ہو سکی اور آخر خودکشی کر کے سکون حاصل کرنے میں اس کا خاتمہ ہو گیا۔[2] پھر اس کی نقل میں بھی بعض آدمیوں نے خودکشی کر لی۔

فارنہیم اور لنڈبرگ لکھتے ہیں:[3]

"بہت سی بیماریوں اور کم عمری کی موتوں اور افلاس سے محفوظ ہونے اور بے مثال دولت مندی میں کھیلنے کے باوجود لوگوں کی اکثریت بڑے اصرار کے ساتھ غمگین رہنے پر تلی ہوئی ہے۔ یہ لوگ دن بدن زیادہ ناخوش ہوتے جا رہے ہیں اتنا کہ اس سے پہلے کبھی نہ ہوئے تھے ..... انسان

1, LIFE MAGAZINE DATED SEPTEMBER 5, 1966

2, AGONY OF MARILYN MONROE BY GEORGE CARPOZI JNR

3, MODERN WOMAN PAGES 25, 26, 28

اگرچہ اس سے پہلے بھی نفرت اور لڑائی کا شکار رہا ہے لیکن یہ موجودہ زمانے کے ترقی یافتہ انسان کے لیے ہی باقی رہ گیا تھا کہ وہ تشدد اور دہشتناکی کا ایک اخلاقی نظام بنا ڈالے .... مارکسزم ناقابلِ صلح نفرت کی تبلیغ کرتی ہے اور جو لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں ان کے لیے آسان نسخہ یعنی موت تجویز کرتی ہے ...... اس نسخہ کا نشانہ لاکھوں اشخاص بنائے گئے۔ ان لوگوں میں صرف سرمایہ دار اور امیر ہی نہ تھے۔ بلکہ زیادہ تر غریب کاشتکار تھے۔ لیکن ان میں اور پیشوں کے لوگ بھی شامل تھے۔ حتیٰ کہ آخر کار بالشویک پارٹی کے چوٹی کے لیڈر بھی اس نفرت کے نسخہ اور طوفان کا ہدف بننے سے نہ رہ سکے"۔

سید قطب شہید کی مشہور کتاب

معالم فی الطریق

کا اُردو ترجمہ **نقوش راہ** کے نام سے مکتبہ الحسنات نے شائع کیا ہے۔
پاکستان میں یہ کتاب ادارہ مطبوعات طلبہ ۴۶/۱۲ نزد سبیلہ مارکٹ کراچی سے مل سکتی ہے۔

بچوں کے پسندیدہ پرچے پندرہ روزہ

"نور" لاہور

کا سالنامہ "کہانی نمبر" مئی ۱۹۶۸ء میں شائع ہو رہا ہے۔ لکھنے والوں میں کئی نامور اہلِ قلم شامل ہیں۔ رنگین طباعت ۱۱۰ صفحات۔ قیمت فی پرچہ ۱/- روپیہ

سالانہ خریدار بننے والوں کو اسی قیمت میں دیا جائے گا

پتہ: ادارہ بتول - ۴ - اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

رسائل و مسائل

نبی کریمؐ کے متعدد نکاحوں میں کیا مصلحت تھی؟

سوال: مَیں آج کل امریکہ میں مقیم ہوں۔ یہاں عیسائیوں سے مذہبی موضوعات پر تبادلۂ خیالات ہوتا رہتا ہے۔ یہ لوگ اور بالخصوص ان کے مذہبی رہنما تعددِ ازواج کے مسئلے پر بہت اُلجھتے ہیں۔ یہ چیز کسی طرح ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ اس سلسلے میں وہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نو شادیوں پر بھی اعتراضات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ آپ نے حضرت عائشہؓ سے بہت چھوٹی عمر میں شادی کی جس کی ضرورت ناقابلِ فہم ہے۔

مَیں اور میرے بعض دوسرے مسلمان دوست اپنی حد تک ان کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن معلومات کی کمی کے باعث ہم ان لوگوں کی پوری تشفی نہیں کر سکتے۔ اگر آپ اس معاملے میں ہماری رہنمائی کریں اور اس مسئلے پر ایسی معلومات اور دلائل فراہم کر دیں جن سے تعددِ ازواج اور خاص طور پر آنحضورؐ کی متعدد شادیوں کا حق بجانب ہونا واضح ہو جائے، تو ہمارے بحث و استدلال میں آسانی پیدا ہو جائے گی اور ہم ان شاء اللہ ہر موضوع میں برابر سطح پر اظہار خیال کر سکیں گے۔

جواب (از ملک غلام علی صاحب): یہ ایک عجیب و غریب بات ہے کہ جدید مغربی اقوام تعددِ ازواج کو مذہبی و سماجی بُرائی شمار کرتی ہیں اور ان کے اتباع میں بعض روشن خیال مسلمان بھی اس پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں حالانکہ جدید مسیحیت سے قبل تعددِ ازواج کو تاریخ انسانی میں دینی و اخلاقی لحاظ سے کبھی معیوب یا ناپسندیدہ یا خلافِ تقویٰ نہیں سمجھا گیا۔ آپ ان عیسائی معترضین سے پوچھیے اور خود بھی بائبل کو پڑھ کر دیکھ لیجیے کہ

اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، اور دوسرے انبیاء کی ایک سے زاید ازواج کا ذکر موجود ہے یا نہیں؟ جن لوگوں کو ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نو شادیوں پر اعتراض ہے، تعجب ہے کہ انہیں بائبل کی بیان کردہ ان روایات پر کوئی اعتراض نہیں ہے؟

اصل بات یہ ہے کہ مغرب کی جدید اقوام پر ایک طرف جنسی میلان و رغبت اور دوسری طرف اسلام سے نفرت و جہالت پوری طرح مسلط ہے، اس لیے وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہیں کہ ازدواج کا مقصد فقط شہوانی جذبات کی تسکین ہے۔ لیکن جو شخص بھی عائلی زندگی سے متعلق اسلام کی تعلیمات اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سوانح کا کھلے دل سے بغور مطالعہ کرے، اسے یہ بات بآسانی معلوم ہو سکتی ہے کہ اسلام نے شادی کا حکم دیتے ہوئے متعدد اہم تمدنی مقاصد کو پیش نظر رکھا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی نکاح محض برائے نکاح نہیں کیا، بلکہ ہر ایک نکاح میں کوئی نہ کوئی مصلحت اور اسلام کا اجتماعی مفاد مضمر تھا۔ آپ نے سب سے پہلا نکاح حضرت خدیجہؓ سے کیا جو صاحبِ اولاد بیوہ اور عمر میں آنحضورؐ سے پندرہ برس بڑی تھیں۔ اس نکاح کے وقت آنحضرتؐ کی عمر پچیس سال اور حضرت خدیجہؓ کی چالیس سال تھی۔ اس عنفوانِ شباب میں آپ کی سیرت اتنی پاکیزہ اور بے داغ تھی جس کے کفار بھی معترف تھے۔ پھر آپ نے جب دعوتِ اسلام کا آغاز فرمایا تو اس سے روکنے کے لیے مشرکین نے جو مصالحانہ پیش کش کی تھی اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ آپ کا نکاح حجاز کی حسین ترین عورت سے کر دیا جائے گا۔ مگر آپؐ نے اسے پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ حضرت خدیجہؓ نے بھی آپؐ کے اخلاق و دیانت سے متاثر ہو کر بعثت سے قبل ہی خود آپ سے نکاح کی درخواست کی تھی۔ حالانکہ ویسے وہ اس عمر میں نکاح ثانی کی خواہش و ضرورت نہ رکھتی تھیں۔ آپ ایک نہایت متمول خاتون تھیں اور نکاح کے متعدد پیغامات کو رد کر چکی تھیں۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اگر چاہتے تو کسی نوجوان دوشیزہ سے شادی کر سکتے تھے، مگر آپ نے حضرت خدیجہ کی پختہ و پاکیزہ سیرت کی بنا پر آپؓ سے نکاح کیا اور جب تک آپؓ زندہ رہیں، دوسرا نکاح نہیں کیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ یہ نکاح نہایت خیر و برکت کا موجب بنا۔ حضرت خدیجہؓ آنحضورؐ کے نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد سب سے پہلے ایمان لائیں اور اپنی جان و مال کو آنحضورؐ کی ذات اقدس کے لیے تا زیست وقف کر دیا۔

حضرت خدیجہؓ کی وفات کے بعد آنحضورؐ نے ایک دوسری سن رسیدہ بیوہ خاتون حضرت سودہؓ سے نکاح کیا تاکہ وہ کم سن صاحبزادیوں کی تربیت اور نگرانی کر سکیں اور دیگر امور خانہ داری سرانجام دیں۔ حضرت سودہؓ نہایت مستحکم سیرت کی مالک تھیں۔ انہوں نے محض اسلام کی خاطر حبشہ کو ہجرت کی تھی۔ اور بڑے صابر سمجھے جاتے تھے۔ چار برس تک تنہا وہی آپ کی بیوی رہیں۔ اس کے بعد آپؐ نے یہ ضروری سمجھا کہ آپ کے حرم میں کوئی ایسی چھوٹی عمر کی خاتون داخل ہوں جنہوں نے اپنی آنکھ اسلامی ماحول ہی میں کھولی ہو اور جو نبی کے گھر آنے میں آکر پروان چڑھیں تاکہ ان کی تعلیم و تربیت ہر لحاظ سے مکمل اور مثالی طریق پر ہو اور وہ مسلمان عورتوں اور مردوں میں اسلامی تعلیمات پھیلانے کا مؤثر ذریعہ بن سکیں۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے مشیتِ ربانی سے حضرت عائشہ صدیقہ کو منتخب فرمایا۔ ان کے والدین کا گھر تو پہلے ہی نورِ اسلام سے منور تھا۔ عالمِ طفولیت ہی میں انہیں وہاں سے کاشانۂ نبوت تک پہنچا دیا گیا تاکہ ان کی سادہ لوحِ دل پر اسلامی تعلیم کا گہرا نقش مرتسم ہو جائے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت عائشہ نے اپنی اسی نو عمری میں کتاب و سنت کے علوم میں گہری بصیرت حاصل کی، اسوۂ حسنہ اور آنحضورؐ کے اعمال و ارشادات کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ رکھا اور درس و تدریس اور نقل و روایت کے ذریعے سے اسے پوری امت کے حوالے کر دیا۔ حضرت عائشہ کے اپنے اقوال و آثار کے علاوہ ان سے دو ہزار دو سو دس ۲۲۱۰ مرفوع احادیثِ صحیحہ مروی ہیں اور حضرت ابوہریرہؓ کو چھوڑ کر صحابہ و صحابیات میں سے کسی کی مرویات اس سے زائد نہیں ہیں۔ حضرت عائشہ کی کوئی اولاد نہ تھی۔ آپ نے بہت سے بچوں کو آغوشِ تربیت میں لے کر پالا اور انہیں علم سکھا کر معلمین و معلمات بنا دیا۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت فقط تبلیغ و تلقین تک محدود نہ تھی بلکہ یہ ایک سرفروشانہ جدوجہد کی بنیاد تھی جس کا مقصد نظامِ زندگی میں عملاً انقلاب برپا کرنا تھا۔ ایسے حالات میں یہ بات انتہائی اہمیت رکھتی تھی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے قریب ترین اور مخلص ترین رفیقوں کے ساتھ شادی بیاہ کے تعلقات قائم کر کے انہیں معاشرے میں ممتاز کر دیں۔ چنانچہ ایک طرف آپ نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے اپنی صاحبزادیوں کا نکاح کر دیا اور دوسری طرف حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کی صاحبزادیوں کو اپنی زوجیت میں لے کر چاروں سے اپنے تعلق کو دائمی استحکام بخش دیا۔ اسی طرح آپ نے بعض بااثر اور نو مسلم قبیلوں سے بھی قرابت داری

پیدا کرکے انہیں اسلام کا حامی بنایا اور ان میں جو لوگ مخالف تھے ان کی مخالفت سرد کر دی۔ حضرت ام سلمہؓ ایک مومنہ صادقہ اور زیرک خاتون تھیں مگر بنو مخزوم کے اس خاندان سے تھیں جس کا ایک فرد ابو جہل تھا۔ حضرت ام حبیبہؓ نے اسلام کی راہ میں جس طرح اپنی جان جوکھوں میں ڈالی تھی اور جس جان نثاری اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کیا تھا، اس کے بیان کی حاجت نہیں۔ مگر ان کا باپ ابو سفیان فتح مکہ تک کفار کا سردار تھا۔ ان دونوں ذی مرتبہ خواتین کو آنحضورؐ کا شرفِ زوجیت عطا کرنا ان کے ذاتی اوصاف کا اعتراف بھی تھا اور اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ان دونوں خاندانوں کی معاندانہ سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

بعض مطلقہ صحابیات کو ان کی دلجوئی کی خاطر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نکاح میں لیا۔ متبنّٰی بنانے کی جاہلانہ رسم کو مٹانے کے لیے آنحضورؐ کو اللہ نے اپنے منہ بولے بیٹے (حضرت زید) کی مطلقہ حضرت زینبؓ بنت جحش سے شادی کرنے کا حکم دیا۔ حضرت زینب آپ کی پھوپھی زاد بہن تھیں، اگر آپ چاہتے تو حضرت زید سے پہلے آپ ان کو رشتہ ازدواج میں منسلک کر سکتے تھے۔ مگر پہلے آپ نے نسب کی اونچ نیچ مٹانے کے لیے ان کا نکاح ایک آزاد کردہ غلام سے کیا۔ پھر جب اس جوڑے میں نباہ نہ ہو سکا اور نوبت طلاق تک پہنچی تو آپ نے حضرت زینبؓ کو اپنے حرم میں داخل فرما کر ان کی تسکین قلب کا سامان بھی کر دیا اور جاہلیت کے اس رواج کی جڑ بھی کاٹ دی جس کی رُو سے متبنّٰی حقیقی اولاد کی صف میں شمار ہوتا تھا۔ انہی کی ایک ہم نام ام المومنین حضرت زینبؓ بنت خزیمہ تھیں جو حضرت عبداللہ بن جحش کے نکاح میں تھیں۔ یہ حضرت زینب کے تیسرے شوہر تھے اور جنگِ اُحد میں انہوں نے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے زخمی دل پر مرہم رکھتے ہوئے انہیں بھی اپنی زوجیت میں لے لیا اور اس سعادت سے بہرہ مند ہونے کے بعد یہ فقط دو یا تین مہینے زندہ رہ کر جنت میں جا بسیں۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ حضرت ام سلمہ کے شوہر ابو سلمہ نے بھی جنگِ احد میں زخمی ہو کر وفات پائی تھی اور رسولِ اکرمؐ نے اس کے بعد حضرت ام سلمہ سے نکاح کر کے ان کے چار چھوٹے چھوٹے بچوں کو اپنی تولیت و تربیت میں لے لیا تھا۔ اسی طرح حضرت ام حبیبہؓ کے خاوند نے اگرچہ حبشہ کی طرف ان کے ساتھ ہجرت کی تھی مگر وہاں جا کر وہ عیسائی ہو گیا اور ام حبیبہ اپنی معصوم بچی حبیبہ کے ساتھ غریب الدیار اور بے یار و مددگار ہو کر رہ گئیں۔ اس پر آنحضورؐ نے انہیں حبشہ ہی میں پیغامِ نکاح بھجوایا۔ نجاشی نے خود آنحضرت

کے وکیل کے ذریعے سے نکاح منعقد کرایا اور حضرت ام حبیبہؓ کو آپ کے پاس بھجوایا۔ حبیبہؓ بھی اپنی ماں کے ساتھ آئیں اور نبی کریمؐ کی ربیبہ بن کر آپ کی سرپرستی میں پروان چڑھیں۔

ام المومنین حضرت جویریہؓ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں اور غزوۂ مریسیع میں اسیر ہو کر آئیں اور ایک صحابی ثابتؓ بن قیس کے حصے میں آئیں۔ آنحضورؐ نے ان کی خاندانی نجابت کا احساس کر کے ان کا فدیہ خود ادا فرمایا اور انہیں آزاد کر کے ان سے نکاح کر لیا۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ صحابہ کرام نے ان کے قبیلے کے سارے قیدیوں کو رہا کر دیا جن کی تعداد سو سے زیادہ تھی۔ اسی طرح کا معاملہ حضرت صفیہؓ کا بھی ہے۔ وہ بھی جنگی قیدیوں میں سے تھیں اور ابتدا میں حضرت دحیہ کلبی کے حصے میں آئی تھیں مگر ان کا والد بھی یہود کا قائد و رئیس تھا، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں بھی آزاد فرما کر خود ان سے نکاح کیا تاکہ ان کی دل شکنی نہ ہونے پائے۔ اور اس رشتہ کی وجہ سے یہودیوں کی دشمنی بھی کم ہو جائے۔

بہرکیف جہاں تک بھی غور کیا جاتے یہ حقیقت بالکل واضح اور منقح ہو کر سامنے آتی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے بھی نکاح فرمائے ہیں ہر ایک میں کوئی نہ کوئی دینی و ملی مصلحت و حکمت پوشیدہ تھی بلکہ ہر ایک میں متعدد مصالح پیش نظر تھے۔ اور یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ حضرت عائشہؓ کے ماسوا جملہ ازواج مطہرات بیوہ، مطلقہ یا شوہر دیدہ تھیں۔ لیکن جن لوگوں کے اعصاب پر عورت کا نقطۂ جنسی پہلو سوار ہے اور جن کی نظر بطن و صنف کے مسائل سے متجاوز نہیں ہو سکتی وہ اگر ان مصلحتوں کو نہ دیکھ سکیں جو ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نکاحوں میں کارفرما تھیں، تو کوئی تعجب کا مقام نہیں ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے ہاں شادی سے پہلے جنسی تعلقات، شادی کے بعد دائرۂ ازدواج سے باہر جنسی تعلقات، اور بیوی کی موجودگی میں داشتائیں رکھنا، معمولات میں داخل ہو چکا ہے اور یہ اسلام کے تعدد ازدواج کے منہ آتے ہیں۔

---

۱۱ مئی ۱۹۵۳ء کو مارشل لا کورٹ کا ایک فیصلہ بجلی بن کر گرا اور ہزاروں نہیں لاکھوں کو تڑپا گیا۔
ہفت روزہ "آئین" ریلوے روڈ لاہور اسی سلسلے کی یاد میں ایک **اشاعت خاص** میں سمیٹ رہا ہے جو مئی کے وسط تک منظر عام پر آجائے گی۔

مطبوعات

امام اعظمؒ اور علم الحدیث | مؤلفہ مولانا محمد علی صاحب کاندھلوی، صدر دارالعلوم شہابیہ، رنگپورہ روڈ، سیالکوٹ شہر۔ ضخامت ۸۰۰ صفحات۔ قیمت پندرہ روپے۔

یہ ایک سنجیدہ تحقیقی کتاب ہے جس کی تالیف و ترتیب میں خاصی محنت سے کام لیا گیا ہے۔ بعض اوقات امام ابوحنیفہؒ کے خلاف تقلیل الحدیث ہونے یا حدیث سے بے اعتنائی برتنے کا بے جا الزام لگا دیا جاتا ہے۔ اس تالیف کا اصل مقصد اسی الزام کا ابطال ہے، لیکن موضوع سے تعلق و مناسبت رکھنے والے متعدد دیگر مباحث ایسے ہیں جن پر اس کتاب میں تفصیلی کلام کیا گیا ہے، یہ مباحث اصولی بھی ہیں اور فروعی بھی۔

آغاز کتاب میں حدیث و سنت اور اس کی تدوین و محافظت پر ضروری بحث کے بعد امام ابوحنیفہ کے طلب علم و اخذِ حدیث اور آپ کے شیوخ و اساتذہ کے حالات بیان کیے گئے ہیں۔ اسی سلسلے میں کتاب الآثار، دوسری صدی کے دیگر مصنفات و مسانید اور تیسری صدی کی کتبِ حدیث بالخصوص صحاح ستہ کا تعارف کرایا گیا ہے۔ اس کے بعد حدیث کے تحمل و روایت، ردّ و قبول اور جرح و تعدیل کے وہ اصول و شرائط بیان ہوتے ہیں جو امام صاحب کے پیشِ نظر رہے ہیں۔ کتاب کا یہی حصہ اہم ترین ہے جس میں محدثانہ اور فقیہانہ نقطۂ نظر کا تقابل کیا گیا ہے اور یہ بہت عمدہ اور مفید مباحث پر مشتمل ہے۔ اواخر کتاب میں امام صاحب کے تلامذہ، خاص طور پر ایسے شاگردوں کا تذکرہ ہے جو اپنی جگہ پر حدیث و فقہ کے امام شمار کیے گئے ہیں۔

اس تصنیف میں، جیسا کہ ظاہر ہے، بعض غلط فہمیوں کی تردید ضروری تھی اور بعض اختلافی بحثوں کا آنا بھی ناگزیر تھا۔ لیکن اس میں جوابات بھی کہی گئی ہے متین لب و لہجہ اور مدلل انداز میں کہی گئی ہے، مناظرانہ

رنگ کہیں بھی پیدا نہیں ہونے پایا۔ ہر صفحے پر کم و بیش دو چار حوالے امہاتِ کتب کے درج ہیں۔ جدید اسلوبِ تالیف کے مطابق آخر میں اسماء و اعلام اور مآخذ و عناوین کے مفصل اشاریے موجود ہیں۔ کتاب کے اندر جابجا اہم مذکور شخصیتوں کے تراجم حواشی میں دے دیے ہیں۔ کہیں کہیں کتابت کی ایک آدھ غلطی نظر آئی، مثلاً ص ۶۸۲ پر "بھول کر کھانے پینے سے روزہ ٹوٹنے کا فیصلہ ابوحنیفہ نے اسی بنا پر کیا ہے" یہاں ٹوٹنے سے پہلے "نہ" کا لفظ چھوٹ گیا ہے۔ بحیثیت مجموعی کتابت، کاغذ، طباعت ہر شے اچھی اور صاف ستھری ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب علمی و دینی حلقوں میں کماحقہٗ التفات اور پذیرائی حاصل کرے گی۔

حیاتِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم | تالیف: محمد حسین ہیکل، سابق وزیر تعلیم حکومتِ مصر۔ ترجمہ: مولانا ابویحییٰ امام خان نوشہروی مرحوم۔ شائع کردہ: ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور۔ قیمت: ۲۲ روپے پچاس پیسے۔ صفحات ۶۵۳۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ پاک پر ہر دور میں جتنی کتب تصنیف ہوئی ہیں، اُن میں زیرِ تبصرہ کتاب ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں فاضل مُصنّف کے پیشِ نظر چونکہ حضورؐ کی ذاتِ اقدس کے بارے میں مسیحی مصنفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہے، اس لیے انہوں نے ان مقامات پر بڑی شرح و بسط سے بحث کی ہے جو ان معاندین کے اعتراضات کا ہدف ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو یہ کوشش بڑی کامیاب ہے۔ پھر مصنف نے کتاب کے لیے مواد تلاش کرنے میں بھی بڑی محنت اور عرق ریزی کی ہے اور ہر بات کو چھان پھٹک کر قبول کیا ہے۔ لیکن اس کتاب میں دو ایک باتیں ایسی بھی ہیں جو قابلِ غور ہیں۔ ایک تو فاضل مصنّف کے نقطۂ نظر میں مرعوبیت کا رنگ نظر آتا ہے۔ خصوصاً اُن مباحث میں جن پر اہلِ مغرب نے بے دے کی ہے۔ فاضل مُصنّف نے ان مقامات پر سیر حاصل بحث کر کے الزامات کو دور کرنے کی کوشش تو کی ہے لیکن ان کا موقف کئی ایک جگہوں پر معذرت خواہانہ ہو گیا ہے۔ دوسرے حضورؐ کے معجزات کو قریب قریب نظر انداز کیا گیا ہے اور تیسرے جن جن کتب سے رجوع کیا گیا ہے آخر میں اُن کے نام تو درج کر دیے گئے مگر حاشیہ میں اُن کی پوری طرح صراحت نہ ہو سکنے کی وجہ سے بعض اوقات

اچھی خاصی دقت پیش آتی ہے۔ ان خامیوں کے باوجود یہ کتاب بڑی قابلِ قدر ہے۔ مولانا ابویحییٰ امام خاں نے بڑی محنت سے اسے اُردو کے قالب میں ڈھالا ہے اور ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ نے اسے بڑے اہتمام کے ساتھ ٹائپ میں شائع کیا ہے۔

بقیہ اشارات

حکمران بھی اس کے مرتبہ ومقام اور اس کی ساکھ سے پوری طرح واقف ہوتے ہیں۔ لیکن دونوں مطلب براری کی خاطر اسے اہمیت دیتے ہیں۔ عوام اس کی طرف اس لیے رجوع کرتے ہیں کہ یہ حکومت سے ان کے بعض ناجائز کام نکلوا لینے میں اُن کی مدد کرتا ہے۔ اور حکمران بوقتِ ضرورت اس سے اپنی حمایت حاصل کرتے ہیں۔ یہ طبقہ کبھی کسی معاملے میں مخلص نہیں ہوا۔ اور اس کی وفاداریاں کبھی کسی کے ساتھ وابستہ نہیں رہیں۔ آزادی سے پہلے جب انگریز اور اس کی بنائی ہوئی سیاسی جتھے بندیوں کا غلبہ تھا۔ یہ طبقہ اُن کے ساتھ رہا۔ غیر ملکی اقتدار رخصت ہونے سے پہلے جب مسلم لیگ برسرِاقتدار آتی نظر آئی تو یہ اُس کی صفوں میں آگھسا۔ پھر جب مسلم لیگ کے ہاتھ سے زمامِ کار نکل گئی تو جس جس کی طرف اقتدار منتقل ہوتا رہا، یہ طبقہ بھی اس کا حاشیہ بردار بنتا چلا گیا۔ اور اب یہ کنونشن لیگ کی عقیدت کا قلادہ اپنی گردن میں ڈالے ہوئے ہے۔ کسی جماعت یا فرد کے ساتھ یہ کتنا مخلص ہے اس کا اندازہ صرف اس ایک بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ سکندر مرزا کے دورِ اقتدار میں جو لوگ ری پبلکن پارٹی کی محبت کا دم بھر رہے تھے، صدر محمد ایوب خاں کے برسرِاقتدار آتے ہی انہوں نے اُس سے آنکھیں پھیر لیں اور اس پارٹی کی لاش بے گور وکفن ہی پڑی رہ گئی۔ آج تک کسی نے اس غریب کی تجہیز وتکفین بھی نہ کی۔ اس طبقہ کے افراد جس طنطنے کے ساتھ موجودہ حکمرانوں کے حق میں صبح وشام جو بیان دے رہے ہیں وہ کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ عوام کے کان اُن سے مانوس ہی نہیں بلکہ انہیں سُن سُن کر پک گئے ہیں۔ صرف ممدوحوں کے نام بدلتے رہتے ہیں۔ مدح وستائش کے الفاظ میں

کوئی تبدیلی نہیں ہوتی۔

یہ بیانات ہم نے مرحوم لیاقت علی خان کے حق میں سنے۔ پھر یہی غلام محمد اور سکندر مرزا کے عہد میں سنے گئے۔ اور اب یہی ہم جناب فیلڈ مارشل محمد ایوب خاںؔ صاحب کی تعریف میں سُن رہے ہیں۔ ایک ہی طبقہ ہر عہد میں ایک ہی نوعیت کا قصیدہ پڑھتا ہوا سنائی دیتا ہے یہ وہ طبقہ ہے جو کبھی کسی نظامِ صالح کے قیام میں مددگار نہیں بن سکتا۔

دین کی راہ روکنے کے لیے جو مختلف طبقے کام کر رہے ہیں ان میں بعض گمراہ فرقے اور گروہ بھی پیش پیش ہیں اور پوری قوت کے ساتھ اس بات کے لیے کوشاں ہیں کہ مسلم ممالک میں کسی طرح دینِ حق غالب نہ ہونے پائے۔ یہ اگرچہ کھُل کر یہ بات تو نہیں کہتے لیکن ان کی سرگرمیوں اور اُن کے طرزِ عمل سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دینِ حق کے تسلّط کو کسی صورت بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ یہ ہمیشہ اس تاک میں لگے رہتے ہیں کہ مختلف حیلوں بہانوں سے دین کی راہ روکی جائے۔ جب کبھی دینی تحریکات اور اُن کے علمبرداروں پر حکومتیں یا برسرِ اقتدار طبقے دستِ ظلم دراز کرتے ہیں تو انہیں بے حد خوشی ہوتی ہے اور یہ اُن کی کھُل کر تائید کرتے ہیں اور انہیں مزید ظلم ڈھانے کی ترغیب دیتے ہیں۔ ان گمراہ فرقوں کو اس امر کا اچھی طرح احساس ہے کہ وہ غیر اسلامی نظام ہی کے سائے میں پرورش پا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام اگر قائم ہوگیا اور اس کی وجہ سے عوام کے اندر صحیح دینی احساس اور شعور پیدا ہوگیا تو پھر ان کے لیے اپنے گمراہ کن نظریات پھیلانا ممکن نہ رہے گا۔ اس بنا پر یہ سارے گروہ اسلامی نظام کے قیام کی راہ میں سخت مزاحم ہوتے ہیں اور جو لوگ بھی انہیں اس کے لیے کوشش کرتے نظر آتے ہوں اُن کے خلاف یہ ہمیشہ ایک مہم جاری رکھتے ہیں۔ ان گروہوں کا بھی بدقسمتی سے حکومت میں اچھا خاصا اثر رسوخ ہے جس سے کام لے کر پوری قوت کے ساتھ دین کی راہ روک رہے ہیں۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شاہکار تالیف

تفہیم القرآن

سورۃ الاحزاب

مباحث ایک نظر میں

علوم قرآنی کے شائقین کیلئے ایک بیش قیمت کتاب

- نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ کا ایک اہم باب
- غزوۂ احزاب کا تاریخی پس منظر
- پردہ کے ابتدائی احکام
- متبنیٰ کی اسلامی معاشرہ میں صحیح حیثیت
- مسئلہ ختم نبوت پر مفصل بحث
- اسلامی تہذیب و معاشرت کا معیار مطلوب
- اسلامی احکام کا تدریجی نفاذ
- نکاح و طلاق کے احکام
- اسلام کے معاشرتی آداب

طلباء۔ قانون دان حضرات اور علوم اسلامی کے محققین کے لئے

ایک ناگزیر کتاب

آفسٹ کی حسین طباعت

کپڑے کی مضبوط جلد

خوبصورت گردپوش

ہدیہ

صرف چند روپے پچاس پیسے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ شاہ عالم مارکٹ لاہور۔

سُنّت کی آئینی حیثیت

از: مولانا سید ابُوالاعلیٰ مودودی

— کیا نبیؐ کے بغیر کتابُ اللہ لوگوں کی ہدایت کے لیے کافی ہے ؟

— کیا قرآن مجید کو سنّتِ نبویؐ کے بغیر صحیح طور پر سمجھا جا سکتا ہے ؟

— قرآن مجید کی تشریح کا حق کس کو حاصل ہے ؟
عربی سے نابلد اور خود ساختہ شارحین کو یا قرآن لانے والے نبیؐ کو ؟

— اسلامی آئین و قانون کے مآخذ کیا ہیں ؟

— سُنّتِ نبویؐ کا دین میں صحیح مقام کیا ہے ؟

— کیا سُنّتِ نبویؐ ہم تک صحیح اور محفوظ حالت میں پہنچی ہے ؟

— وحی کی حقیقت اور اس کی اقسام ،

— منکرینِ حدیث و سُنّت کا مُسکت و مُدلّل جواب .

قانون و فقہ کے طلبا کے لیئے ایک بلند پایہ تحقیقی کتاب

— حامیانِ سُنّت کے لیے مضبوط دلائل کا بیش قیمت مُرقّع —

آفسٹ کی حسین کتابت و طباعت — قیمت ۸/۵۰ روپے

اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ۔ شاہ عالم مارکٹ لاہور